قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

مئی 1966

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

بزم لاہور

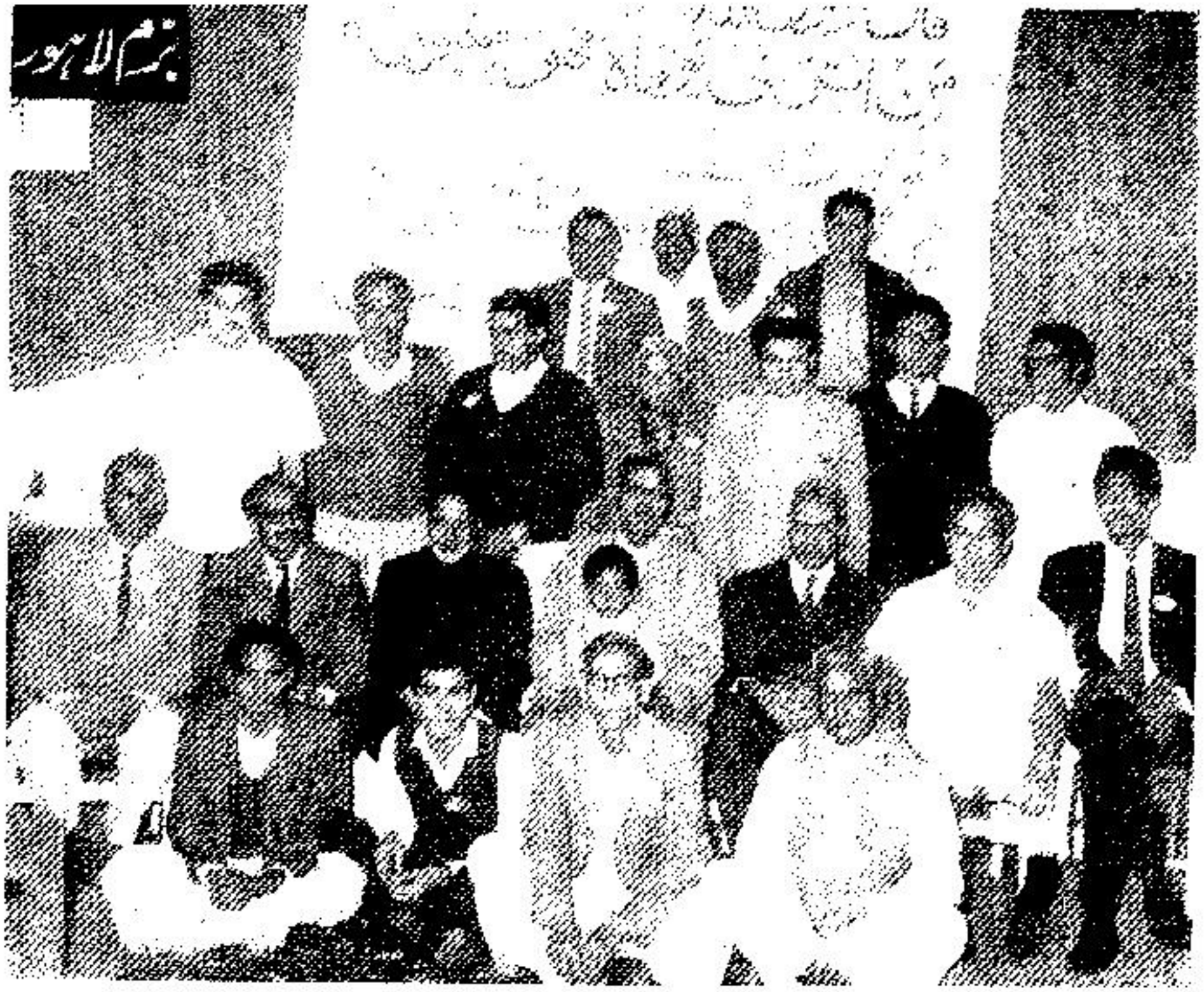

بزم ڈیرہ اسماعیل خان

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک

پاک و ہند سے

سالانہ ———— دس روپے

غیر ممالک سے

سالانہ ———— ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاک و ہند سے

ایک روپیہ

ٹیلیفون ۸۰۸۰۰

خط و کتابت کا پتہ

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

جلد ۱۹ — مئی ۱۹۶۶ء — نمبر ۵

فہرستِ مضامین

(۱) لمعات ———— ۲

(۲) ٹیڑی بڑی زنجیرِ ساقی —— ڈاکٹر صلاح الدین اکبر ———— ۱۰

(۳) باب المراسلات ———— ۲۵

(۴) نقد و نظر —— (مجموعہ قوانینِ اسلام) ————

—— (تبصرہ مجموعہ بر تفہیمات مودودی) (تاویل الاحادیث) —— ۳۳

(۵) طلوعِ اسلام کالج ———— ۳۷

(۶) طلوعِ اسلام کنونشن —— بزمِ مذاکرہ

—— (میں کیوں زندہ رہنا چاہتا (چاہتی) ہوں) —— ۴۰

(۱) —— ثریا عندلیب ———— ۴۱

(۲) —— خالد اسلام ———— ۴۵

(۳) —— اظفر شفقت ———— ۴۶

(۴) —— منیر مظفر ———— ۵۲

(۵) —— مس عزالہ خان ———— ۶۰

(۶) —— مس تبسم انور ———— ۶۴

(۷) —— نجمہ کوثر ———— ۶۷

(۸) —— سلطے پیرزادہ ———— ۶۸

(۹) صدرِ مذاکرہ کا تبصرہ ———— ۶۹

ایڈیٹر۔ صفدر سلیمی، ناشر۔ سراج الحق، مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور، پرنٹر شیخ محمد اشرف، مطبوعہ۔ اشرف پریس، ایبٹ روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

تعلیم کا مسئلہ

ہم شروع سے لکھتے چلے آرہے ہیں کہ جب تک ہمارا نظامِ تعلیم صحیح خطوط پر متشکل نہیں ہوگا۔ ہم اس مقصد کو حاصل کر سکیں گے جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا تھا۔ اور صحیح اسلامی نہج کی زندگی بسر کرنا تو ایک طرف، ہم دنیا کی زندہ قوموں کی صف میں کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں ہو سکیں گے۔ ہم نے جب بھی اس مسئلہ کو چھیڑا، ہم سے پوچھا گیا کہ ہم بصراحت بتائیں کہ ہمارے نزدیک صحیح نظامِ تعلیم کیا ہے۔ اور اس کی جزئیات اور تفصیلات کیا۔ لیکن ہم نے اس بحث کو ہمیشہ اصولی حدود کے اندر رکھا اور اس کی تفاصیل کو سامنے نہیں لائے۔ اس لئے کہ ملک کے نظامِ تعلیم کا مسئلہ انفرادی نہیں، یہ اجتماعی مسئلہ ہے جس پر حکومت کا کنٹرول ہے۔ اس لئے جب تک حکومت اسے صحیح خطوط پر متشکل کرنے کے لئے آمادگی ظاہر نہ کرے، اس کی تفاصیل و جزئیات پیش کرنا بے معنی ہے۔ گزشتہ کنونشن کی تقریب پر پرویز صاحب نے اپنے خطاب خصوصی ــــ **میرا پیام** ــــ میں اس مسئلہ کی اہمیت کی طرف خصوصی توجہ منعطف کرائی اور سابقہ اشاعت کے لمعات میں ہم نے بھی اس موضوع پر قدرے تفصیل سے لکھا تو ہمیں بعض ذمہ دار گوشوں کی طرف سے مشورۃً کہا گیا کہ اگر ہم اس مسئلہ کی جزئیات مرتب کر کے پیش کرنا بے مقصد یا قبل از وقت سمجھتے ہیں تو کم از کم اس کے بنیادی خط و خال اور حدود متعین کر دیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ موجودہ نظام میں کس حد تک تبدیلی کی ضرورت ہے۔ زیرِ نظر سطور کا محرک یہی مشورہ ہے۔

غایتِ حیات

جو شخص انسانی سطح پر زندگی بسر کرتا ہے اس کے سامنے کوئی نہ کوئی غایتِ حیات (ULTIMATE CONCERN) ہوتی ہے دہم نے "انسانی سطح" کی شرط اس لئے عائد کی ہے کہ حیوانی سطح پر غایتِ حیات جبلّت (INSTINCT) کی متعین کردہ ہوتی ہے۔ اس میں اُس ذی حیات کے انتخاب وارادہ کا دخل نہیں ہوتا۔ انسان اپنی غایتِ حیات خود متعین کرتا ہے) اسی غایتِ حیات کو ایمان یا (FAITH) کہا جاتا ہے۔ مغربی جمہوریتوں میں غایتِ حیات نیشنلزم ہے۔ روس اور چین میں یہ غایت کمیونزم ہے۔ اقبال نے جب کہا تھا کہ ـــــ ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے ـــــ تو اس نے اسی غایتِ حیات کی طرف اشارہ کیا تھا جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ (۶/۱۶۳)

تم اعلان کر دو کہ میرے فرائضِ زندگی اور ان کی ادائیگی کے طور طریق، مختصراً یہ کہ میرا جینا، اور میرا مرنا سب اللہ کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسان کا نشو و نما دینے والا ہے؛

لہٰذا سب سے مقدم سوال یہ ہے کہ ہمارا غایتِ حیات کیا ہے جس کے لئے ہمیں جینا اور عند الضرورت مرنا ہے۔ جس قوم کا غایتِ حیات متعین نہ ہو اس کے افراد کے سامنے حیوانی سطح کے مقصدِ زندگی ـــــ کھانے، پینے، بچے پیدا کرنے اور طبیعی موت مر جانے ـــــ سے بلند کوئی غایتِ حیات نہیں ہوتا۔ اور چونکہ حیوانی سطح پر کسی اخلاقی ضابطہ یا اصول پرستی کا سوال نہیں ہوتا اس لئے ان افراد کے نزدیک جائز اور ناجائز کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اگر انہیں کسی معاشرتی ضابطہ کا پابند بنانا مقصود ہو تو اس کیلئے انہیں حیوانات کی طرح رسّے سے باندھنا اور ڈنڈے سے ہانکنا پڑتا ہے۔ یہ غایتِ حیات (ایمان) ہی ہے جس سے انسان اپنے زورِ دروں سے آمادۂ عمل ہوتا ہے۔ یہی اس کے نزدیک جائز اور ناجائز کا معیار، غلط اور صحیح کی تفریق اور خیر اور شر کی حدِ فاصل قرار پاتی ہے۔ جو قدم اسے اس غایت کی طرف لے جائے وہ اس کے نزدیک جائز، صحیح اور خیر ہوتا ہے۔ اور جو اس سے دور لے جائے وہ ناجائز، غلط اور شر۔

تعلیم کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ اس غایتِ حیات کو اس طرح طالب علموں کے ذہن نشین ہی نہیں بلکہ دل نشین کرائے کہ وہ ان کے شعور اور تحت الشعور، دونوں، کی آواز بن جائے۔ وہ ان کی آرزوں کا منتہیٰ، ان کی تمناؤں کا مرکز، اور ان کے تمام اعمالِ حیات کا مرکز قرار پائے۔ جب ایک انگریز سیاح ''

اپنے وطن کے مفاد کی خاطر، افریقہ کے وحشیوں سے لڑکر بے محابا جان دے دیتا ہے وہ اسی تعلیم کا نتیجہ ہوتا ہے اور جب ایک چینی سپاہی بے دریغ توپ کے دہانے میں اپنا سر دے دیتا ہے تو اس کا جذبۂ محرکہ بھی یہی غایتِ حیات ہوتا ہے۔

ہمارے نظامِ تعلیم کا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں کسی غایت حیات کو سامنے نہیں لایا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری قوم کے نوجوانوں کی زندگی ایک مسافر کی نہیں ہوتی جس کا ہر قدم اپنی منزل کی طرف اٹھتا ہے بلکہ ان کی زندگی سفر کے بجائے آوارگی کی ہوتی ہے جس میں ہر چلنے والا مختلف سمتوں کی طرف چلتا ہے اور اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ میں کس طرف جا رہا ہوں۔ اور ادھر کیوں جا رہا ہوں۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ ابھی تک خود ہماری قوم کا غایت حیات ہی متعین نہیں ہو سکا۔ اس خطۂ زمین کو ہم نے اسلام کے نام پر حاصل کیا تھا لیکن اسلام ہمارا غایتِ حیات بنا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود اسلام کے متعلق بھی یہ طے نہیں پا سکا کہ وہ ہے کیا؟ اسلام کا اجارہ دار، مذہبی پیشوائیت کو سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اسلام کا جو تصور ان کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے اگر اسے اختیار کیا جائے تو، زندگی کے بلند مقاصد کا حصول تو ایک طرف، وہ ہمیں مصافِ حیات میں چار قدم چلنے کے قابل بھی نہیں چھوڑتا۔ ملک کے ہوش مند طبقہ کو اس کا احساس ہے لیکن وہ اس کی مخالفت کی جرأت نہیں کرتا۔ اس لئے کہ یہ دورِ جمہوریت ہے جس میں سیاسی کامیابی کا مدار، آراء کی اکثریت پر ہے اور ملک کی اکثریت (جاہل ہونے کی وجہ سے) مذہبی پیشوائیت کی گرفت میں ہے۔ اس لئے یہ طبقہ نہ تو اس اسلام کو غایت حیات قرار دے سکتا ہے جو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے اور نہ ہی کھلے بندوں اس کی مخالفت کی ہمت اپنے اندر پاتا ہے کہ اس سے اس کے سیاسی مفاد پر زد پڑتی ہے۔ وہ اسی میں اپنی سیاسی مصلحت دیکھتا ہے کہ قوم کو گومگو کی حالت میں رکھا جائے اور نہیں سمجھتا کہ جب کوئی قوم غایت حیات کے بغیر رہے تو اس میں غیر شعوری طور پر انارکی پھیل جایا کرتی ہے۔

اس کشمکش سے تنگ آکر مسلمانوں کے دوسرے ملکوں نے نیشنلزم کو اپنے لئے غایت حیات قرار دے لیا۔ لیکن ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم ایسا بھی نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ نیشنلزم کو خلافِ اسلام قرار دے کر (اور جو واقعی خلافِ اسلام ہے) ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا۔ اگر ہم نیشنلزم کو اپنا غایت حیات قرار دیتے ہیں تو پاکستان کی ہندوستان سے علیحدگی کے لئے کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا، اس باب میں بھی ہم عجیب کشمکش میں گرفتار ہیں۔ ہمارا آئینی ڈھانچہ نیشنلزم کی بنیادوں پر استوار ہے لیکن ہم نیشنلزم کو غایت حیات بھی قرار نہیں دیتے۔

اس پریشانیٔ فکر و نظر سے ہمارا نوجوان طالب علم جلد اٹھتا ہے۔ اس کی طرف سے آئے دن جو ضوابط شکنی کے مظاہرے ہوتے ہیں اس کی نفسیاتی علت یہی ہے۔ جب تک ہم اپنا غایت حیات متعین نہیں کرتے، ہمارا نظامِ تعلیم کبھی صحیح خطوط پر متشکل نہیں ہو سکتا۔

اسلام بطور غایت حیات

مسلمان کی حیثیت سے ہمارا غایت حیات اسلام کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ نیز جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے (عام اصطلاح میں) سیاسی نقطۂ نگاہ سے بھی ہمارا یہی غائیت حیات ہو سکتا ہے۔ اس باب میں دو آراء ہو ہی نہیں سکتیں۔ لیکن اسلام ہمارا غایت حیات بن نہیں سکتا جب تک اسے مذہبی پیشوائیت کی گرفت سے چھڑا نہ لیا جائے۔ ہمیں مذہبی پیشوائیت سے نہ کوئی چڑ ہے، نہ خدا واسطے کا بیر جو ہم اپنی اس پکار کو مسلسل دہرائے چلے جا رہے ہیں۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ دنیا میں جب اور جہاں بھی آسمانی انقلاب کی آواز بلند ہوئی، مذہبی پیشوائیت نے سب سے پہلے اس کی مخالفت کی۔ خود تاریخ انسانیت اس کی شاہد ہے کہ کاروانِ انسانیت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مذہبی پیشوائیت کا وجود رہا ہے۔ خود ہمارے زمانے کی تاریخ بتا رہی ہے کہ جب تک کسی قوم کے شجرِ زندگی پر مذہبی پیشوائیت کی اکاس بیل مسلط رہی، اسے برگ و بار نصیب نہ ہوا۔ اسے سرسبزی و شادابی اسی صورت میں میسر آئی کہ اس نے اس اکاس بیل کو جھٹک کر اتار پھینکا۔ اسلام مذہبی پیشوائیت کے خلاف کھلا ہوا چیلنج تھا۔ جب تک وہ ہمارا غایتِ حیات رہا، مذہبی پیشوائیت کا نام و نشان تک نظر نہ آیا۔ جب اسلام ان کی گرفت میں آیا، نہ اسلام، اسلام رہا۔ نہ مسلمان، مسلمان — اس لئے ہمارے ہاں اسلام غائیتِ حیات اسی صورت میں بن سکتا ہے کہ اسے مذہبی پیشوائیت کی اجارہ داری سے نجات دلائی جائے۔

خدا کا تصور

اسلام کی بنیاد خدا پر ایمان ہے۔ لیکن خدا کا جو تصور ہماری مذہبی پیشوائیت پیش کرتی ہے، ایک تعلیم یافتہ نوجوان اس خدا کو اپنے لئے کبھی قابلِ قبول نہیں پاتا۔ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے پیش کردہ خدا کا تصور ایک مستبد حاکم (ڈکٹیٹر) کا تصور ہے جس نے انسان کو اس دنیا میں اس لئے بھیج رکھا ہے کہ یہ ہر وقت اس سے ڈرتا کانپتا رہے اور اسے خوش کرنے کے لئے اس کے حضور قصیدے پڑھتا اور اس

کی پرستش کرتا رہے۔ اس خدا کے ہاں نہ کوئی قاعدہ ہے نہ قانون ۔ وہ جو جی میں آئے کرتا ہے۔ وہ جسے چاہے خزانے عطا کر دیتا ہے، جس سے چاہے رزق چھین لیتا ہے۔ جو شخص اس کے کسی فیصلے کے خلاف (لب کشائی کرنا تو ایک طرف) دل میں احساس شکایت تک بھی لائے، وہ اسے جہنم رسید کر دیتا ہے ظاہر ہے کہ جس مذہب کی بنیاد خدا کے اس تصور پر ہو، ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان اسے کبھی غایت حیات نہیں بنا سکتا۔ آپ جب تک اس تصور کی جگہ خدا کا وہ تصور پیش نہیں کریں گے جو خود خدا نے اپنی کتاب میں دیا ہے، ہمارا نوجوان طبقہ اسے کبھی قابل قبول نہیں سمجھے گا۔ قرآن کی رُو سے، اپنے اپنے تصور کے مطابق خدا کو مان لینا، خدا پر ایمان نہیں کہلا سکتا۔ نزول قرآن کے زمانے میں، یہودی اور عیسائی خدا پر ایمان رکھنے کے مدعی تھے۔ لیکن قرآن نے انہیں بھی خدا پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ خدا کا جو تصور یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں رائج تھا، وہ صحیح تصور نہیں تھا۔ صحیح تصور وہی تھا جسے قرآن نے پیش کیا۔

بعینہٖ یہی صورت آج ہے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت خدا کا جو تصور پیش کرتی ہے وہ خدا کا صحیح تصور نہیں۔ آپ ان نوجوانوں کے سامنے خدا کا قرآنی تصور پیش کیجئے اور دیکھئے کہ وہ اس کی طرف کس طرح لپک کر نہیں آتے۔ لیکن تصور کو بھی بطور عقیدہ (اندھے طور پر ماننے کے لئے) پیش نہیں کیا جائے گا۔ اسے عقل و بصیرت کی رُو سے پیش کیا اور دلائل و براہین کی بنیادوں پر سائنٹیفک طریق سے منوایا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے بچوں کے اساتذہ اور نوجوانوں کے پروفیسرز ایسے ہوں جنہوں نے خدا کو خود بھی اسی طریق سے مانا ہو اور وہ اپنے شاگردوں کے سامنے بھی خدا کا تصور اسی انداز سے پیش کر سکیں۔ اس تصور کی رُو سے وہ دیکھیں گے کہ خدا نے نہ کائنات کو بے مقصد پیدا کیا ہے نہ انسانی زندگی کو بے منزل ۔۔۔ اس کا ہر فیصلہ ایک قاعدے اور قانون پر مبنی (بلکہ اس کا نتیجہ) ہوتا ہے جس میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔

انسانی ذات کا تصور

خدا پر ایمان کے بعد (بلکہ اس کے ساتھ ساتھ) دین کی بنیاد، انسانی ذات کے تصور پر ہے۔ مغربی انداز تعلیم (جو اس وقت ہمارے ہاں رائج ہے) انسان کے متعلق یہ تصور پیش کرتا ہے کہ اس کی زندگی بس اسی دنیا کی طبیعی زندگی ہے۔ جسم کی طبیعی مشینری کے ساکن ہو جانے کے ساتھ انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے حیات آخرت پر زور ضرور دیا جاتا ہے، لیکن محض ایک عقیدہ کے طور پر

وہ اسے نہ علم و بصیرت کی روشنی میں ثابت کر سکتے ہیں، نہ دلائل و براہین کی رُو سے منوا سکتے ہیں۔ قرآن کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ انسان، اس کے طبیعی جسم کا نام نہیں، اس میں ایک اور شے بھی ہے، جو اس کے طبیعی جسم کے ساتھ فنا نہیں ہو جاتی۔ باقی رہتی ہے۔ اسے اس کی ذات (یا نفس) سے تعبیر کیا جاتا ہے ــــ انسان کا ہر عمل (حتیٰ کہ دل میں گزرنے والا خیال بھی) اس کی ذات پر اپنا اثر مرتب کرتا ہے۔ جن اعمال (کاموں) سے اس کی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے انہیں عملِ خیر (نیک عمل) کہا جاتا ہے اور جو اس میں اضمحلال پیدا کرتے ہیں وہ شر (یا برائیاں) کہلاتے ہیں۔ مرنے کے بعد، انسانی ذات کا مقام (یا کیفیت) اس کے ان اعمال کے مجموعی اثر کی رُو سے متعین ہوگا۔ نشو و نما یافتہ ذات، زندگی کے ارتقائی سفر میں اگلی منزل میں پہنچنے کے قابل ہو جائے گی۔ اسے جنت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ غیر نشو و نما یافتہ ذات، آگے بڑھنے سے رُک جائے گی۔ یہ جہنم کی زندگی کہلاتی ہے۔ صحیح نظامِ تعلیم میں، انسانی ذات اور قانونِ مکافاتِ عمل کے اس تصور کو سائنٹیفک طریق سے ثابت اور علم و بصیرت کی روشنی میں پیش کیا جائے گا۔

وحی کا تصوّر

مغربی اندازِ تعلیم کی رُو سے انسانی زندگی میں وحی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس میں انسانی عقل، تجربہ، مشاہدہ، ذرائع علم قرار پاتے ہیں۔ اور ماورائے ادراک، علم کا کوئی سرچشمہ نہیں سمجھا جاتا ــــ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے وحی کا جو تصور پیش کیا جاتا ہے وہ نوجوان طالب علموں کو اقرار کے بجائے، الٹا انکار بلکہ سرکشی کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ (مذہبی پیشوائیت) وحی کو منوانے کے لئے عقل کے چراغ گل کر دیتی ہے۔ حالانکہ وحی، عقل کی وسعتوں کو زیادہ کرنے کے لئے آتی ہے (مثلاً) انسانی آنکھ ایک خاص حد تک دیکھ سکتی ہے۔ اس کے آگے اسے کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر اس آنکھ کے سامنے دوربین رکھ دی جائے تو اس کی حدِ نگاہ حیرت انگیز طریق پر وسیع ہو جاتی ہے۔ یہی کام وحی کی دوربین کرتی ہے۔ وہ انسانی عقل کی حد کو بہت بڑھا دیتی ہے اور ان حقائق کو سامنے لے آتی ہے جن کا انکشاف تنہا عقل کے بس کی بات نہیں ہوتا۔ دین کے نظام میں وحی (نبوت) کو بنیادی حیثیت حاصل ہے لیکن چونکہ وحی کا سرچشمہ ماورائے عقلِ انسانی ہوتا ہے اس لئے اسے سمجھانے کے لئے علم کی گہرائیوں میں جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

مستقل اقدارِ حیات

مذہبی پیشوائیت کے سامنے اقدار یا قوانین کا تصور نہیں ہوتا۔ وہ صرف احکام سے بحث کرتے ہیں

جن کی اطاعت اس لئے کی جاتی ہے کہ اس سے خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ وحی، مستقل اقدار، اور غیر متبدل قوانینِ حیات پیش کرتی ہے۔ جن کے اتباع سے ایسے خوش گوار نتائج مرتب ہوتے جو ان کی صداقت کی زندہ شہادت بن جاتے ہیں۔ وحی کی اہمیت اور افادیت کو اجاگر کرنے کا ذریعہ یہی استنتاجی طریق (PRAGMATIC TEST) ہے۔ ان اقدار و قوانین کو اسی طریق سے سامنے لانا چاہیئے (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) مذہبی پیشوائیت کو اعمال کے نتائج سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک، احکام کی اطاعت کا مقصد خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے اور خدا کی خوشنودی کا مظاہرہ اگلی دنیا میں جا کر ہوتا ہے جس سے خدا خوش ہوتا ہے وہ اسے جنت میں بھیج دیتا ہے جس سے وہ ناراض ہوتا ہے، اسے جہنم کے عذاب میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ سلسلۂ علت و معلول (CAUSE AND EFFECT) کی فضاؤں میں سانس لینے والا صاحب عقل و ہوش طالب علم اس تصور کو کبھی نہیں اپنا سکتا۔ وہ صرف قانون کو سمجھ سکتا ہے اور قرآن کریم کی ساری تعلیم قانون ہی کے تصور پر مبنی ہے۔

تاریخ کا مقام

ہمارا طالب علم، اعمال کے نتائج، دو اور دو چار کی طرح، سامنے دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسے تاریخ امم اس طرح پڑھائی جائے جس سے یہ حقیقت اس کے سامنے واضح طور پر آجائے کہ فلاں قوم نے ان قوانین کا اتباع کیا تو اس سے اسے کس قدر خوش گوار یاں اور مرفہ الحالیاں نصیب ہوگئیں اور فلاں قوم نے ان کی خلاف ورزی کی تو وہ کس قدر ذلت اور خواری کے گڑھے میں جا گری۔ اس سے ان کے سامنے یہ حقیقت بھی آجائے گی کہ وحی نے، قوموں کے عروج و زوال سے متعلق جو قوانین عطا کئے ہیں وہ کس قدر مبنی برصداقت ہیں اور چونکہ وہ غیر متبدل اور ابدی ہیں اس لئے قوموں کی موت و حیات کے فیصلے آج بھی انہی کے مطابق ہوتے ہیں۔ اس طرح، تاریخ، مشاہیر گزشتہ کے سوانح اور اقوام سابقہ کے واقعات کا ریکارڈ نہیں رہے گی بلکہ ایک ایسی لیبارٹری کی حیثیت اختیار کر جائے گی جس میں وحی کے متعین کردہ قوانین کی صداقت کی عملے وجہ البصیرت جانچ پڑتال ہو سکے گی۔

اجتماعی نظامِ حیات

قرآن کے قوانین کی صداقت کے پرکھنے کا دوسرا طریق یہ ہے کہ اپنے زمانے کے مختلف نظامہائے سیاست، معاشرت اور معیشت کو سامنے لایا جائے اور دیکھا جائے کہ ان میں سے جو نظام ان قوانین

سے قریب ہے اس کے نتائج کیا ہیں اور جو ان کے خلاف جاتا ہے اس کے عواقب کیا۔ (ہم نے "قریب" اس لئے کہا ہے کہ کاملۃً قوانین خداوندی کے مطابق صرف اسلام کا نظامِ حیات ہو سکتا ہے، کوئی اور نظام نہیں) پولیٹیکل سائنس، اکنامکس یا سوکس کے مضامین اسی زاویۂ نگاہ سے پڑھائے جانے چاہئیں۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہو سکے گا جب اسلام کا سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام بھی سامنے ہو۔

جہاں تک فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کا تعلق ہے، قرآن کریم نے اس کی بڑی تاکید کی ہے قرآن کے ان مقامات کو نمایاں طور پر طلبا کے سامنے لایا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں یہ بھی بتایا جائے کہ قرآن کی رُو سے، ان قوتوں کا مسخر کرنا مقصود بالذات نہیں۔ انہیں مسخر کرکے، وحی کی متعین کردہ مستقل اقدار کی روشنی میں نوعِ انسانی کی عالمگیر منفعت کے لئے صَرف کرنا، اصل مقصود ہے۔ ان سے مقصد کمزور قوموں پر اپنا غلبہ و تسلط قائم کرنا نہیں بلکہ جو قومیں، کاروانِ حیات میں پیچھے رہ گئی ہیں، انہیں تقویت بہم پہنچا کر، دوسروں کے دوش بدوش چلنے کے قابل بنانا ہے۔ اس مشاطگی سے عروسِ انسانیت کے الجھے ہوئے گیسو سنورتے جائیں گے اور حسنِ کائنات میں نکھار پیدا ہوتا جائے گا۔ تسخیرِ فطرت، مقامِ آدمیت ہے۔ اور ان قوتوں کو وجۂ تزئینِ انسانیت بنانا، فریضۂ مومن!

قوانینِ شریعت

قرآن کریم میں بجز چند ایک احکام کے، زندگی کے عملی معاملات سے متعلق حدود متعین کر دیئے گئے ہیں۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے امتِ مسلمہ اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، جزئی قوانین خود مرتب کرے گی۔ یہ حدود غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کی روشنی میں مرتب کردہ قوانین حالات کے بدلنے سے بدلتے جائیں۔ اس طرح، ثبات و تغیر کے امتزاج سے کاروانِ ملت آگے بڑھتا جائے گا۔

لیکن مذہبی پیشوائیت کا فیصلہ ہے کہ جو جزئی قوانین اسلامی نظام کے کسی دَور میں، اُس زمانے کی ضروریات کے پیشِ نظر، مرتب کئے گئے تھے، وہ ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ حالات کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو، ہمیں ان قوانین کی اطاعت بہرحال و بہر نوع کرنی ہو گی، کسی اسلامی مملکت کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل یا حک و اضافہ کر سکے۔ یہ صورتِ حال نہ صرف اسلامی نظام کے منشاء کے خلاف ہے بلکہ ناقابلِ عمل بھی ہے لیکن مذہبی پیشوائیت اس مؤقف کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، حکومت اسے محسوس کرتی ہے لیکن اسے کھلے بندوں زبان پر نہیں لاتی۔ نتیجہ یہ کہ اٹھارہ برس

گزر گئے، پاکستان میں قانون سازی کی کشتی بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح ایک ہی نقطہ پر گردش کئے جا رہی ہے حکومت نے اس سلسلہ میں کئی ایک ادارے قائم کر رکھے ہیں۔ لیکن ان کا نتیجہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اپنے آپ کو جھوٹا فریب دے لیا جائے کہ قانون سازی کے سلسلہ میں بہت کچھ ہو رہا ہے۔ حکومت جب کوئی نیا قانون بناتی ہے تو مذہبی پیشوائیت اس کے خلاف شور مچا دیتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ قانون فی الواقعہ خلافِ شریعت ہوتا ہے بلکہ اس لئے کہ قانون سازی کے سلسلہ میں مذہبی پیشوائیت آخری اختیار (SOVEREIGN-TY) اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہے۔ "قانون سازی کے سلسلہ ہی میں نہیں۔ وہ ہر اس معاملہ میں جو اس کے نزدیک "شریعت" سے متعلق ہو، آخری فیصلہ کا اختیار حکومت کو دینا نہیں چاہتی، اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی اور اس طرح یہاں عملی تھیاکریسی قائم کرنا چاہتی ہے۔

ہمارا قانون کا طالب علم اس اسلام کو قبول ہی نہیں کر سکتا جس میں اس طرح کی عملی تھیاکریسی کارفرما ہو۔ اس لئے کہ وہ تاریخ اقوام کے مطالعہ سے اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ تھیاکریسی عالمِ انسانیت میں کیا قیامت برپا کیا کرتی ہے۔ لہٰذا یہ اسلام اس کے لئے غایتِ حیات بن ہی نہیں سکتا وہ اس کے مقابلہ میں سیکولرازم کو ترجیح دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا نوجوان ذہنی طور پر سیکولرازم سے زیادہ قریب ہو چکا ہے۔ لیکن چونکہ ہمارا معاشرہ نہ سیکولرازم کو کھلے بندوں قبول کرتا ہے نہ تھیاکریسی کو مسترد کرتا ہے اس لئے یہ نوجوان عجیب مخمصے میں گرفتار ہے۔

ڈیماکریسی

اس کی اس الجھن میں اس لئے بھی اضافہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ہاں اسی ڈیماکریسی کو عملاً رائج دیکھتا ہے جو مغرب میں مروج ہے۔ اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ جب سیکولر انداز کی جمہوریت خود ہمارے ہاں بھی چل رہی ہے تو پھر سیاست میں مذہب کو خواہ مخواہ کیوں گھسیٹ لایا جائے۔ یعنی جب وہ اپنے مسلمان ہونے کے لاشعوری احساس سے مذہب کی طرف جاتا ہے تو وہاں اُسے تھیاکریسی نظر آتی ہے۔ اور جب تھیاکریسی سے بھاگ کر جمہوریت کی طرف آتا ہے تو وہاں اسے لادین سیاست دکھائی دیتی ہے۔ وہ اسی کشمکش میں گرفتار ہے۔ حالانکہ قرآن کی رُو سے بات بالکل صاف اور سیدھی ہے۔ اسلامی نظامِ حکومت امت کے باہمی مشورہ سے چلے گا۔ اس اعتبار سے (اور اس حد تک) وہ نظام جمہوری ہے۔ لیکن امت کے فیصلے، قرآن کریم کی متعین کردہ مستقل اقدار کی حدود کے اندر رہیں گے۔ اس نہج سے یہ نظام دینی ہے، لادینی نہیں۔ ہمارے طالب علموں کو پولٹیکل سائنس اور قانون کی تعلیم اس نقطۂ

نگاہ سے دیکھنی چاہیئے۔

معاشی نظام

اس وقت دنیا میں ایک جدید معاشی نظام کا دور دورہ یا کم از کم چرچا بہت زوروں پر ہے جسے کمیونزم کہا جاتا ہے۔ ہمارا نوجوان طالب علم جانتا ہے کہ نظام سرمایہ داری نے نوع انسان کے ساتھ کیا کیا ہے اس لئے وہ اس جدید نظام کو انسانیت کے لئے آیۂ رحمت سمجھ کر اس کی طرف لپک کر جاتا ہے۔ لیکن اسے وہاں خدا، وحی، مستقل اقدار، قانونِ مکافات، تسلسلِ حیات، غرضیکہ تمام اسلامی تصورات اور اقدار سے انکار بلکہ کشتی ملتی ہے۔ چونکہ اسے ابھی تک لاشعوری طور پر مذہب کے ساتھ تعلق ہے اس لئے وہ وہاں سے واپس آجاتا ہے۔ لیکن ادھر آکر دیکھتا ہے کہ ہماری مذہبی پیشوائیت ایک ایسے نظام کو اسلام کا معاشی نظام کہہ کر پیش کرتی ہے، جسے اپنا کہتے ہوئے، اور تو اور، سرمایہ دار ممالک بھی شرماتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ دیکھتے ہمارا نوجوان طالب علم، جب اپنے ملک پر نگاہ ڈالتا ہے تو وہاں اسے وہ معاشی نظام عملاً رائج نظر آتا ہے جسے اب اس نظام کے علمبردار ممالک بھی پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ وہ اس نظام میں تبدیلی کی آرزو زبان تک لاتا ہے تو مذہبی پیشوائیت اسے کمیونسٹ قرار دے کر کفر و ارتداد کے فتووں سے نوازتی ہے۔ اس سے وہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ تو تنگ آکر کھلے بندوں اسلام کے خلاف سرکشی پر اتر آتے ہیں۔ اور باقی تضادِ ذات (SPLIT-UP PERSONALITY) کے نفسیاتی مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ان طالب علموں کو معاشیات کی تعلیم اس طرح دینی چاہیئے کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ جس فرسودہ نظامِ سرمایہ داری کو اسلام کا معاشی نظام کہہ کر پیش کیا جاتا ہے اسے اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں وہ مسلمانوں کے عہدِ ملوکیت کی یادگار ہے۔ دوسری طرف، کمیونزم کے معاشی نظام کی عمارت جس فلسفہ کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے وہ بڑی ناپائیدار ہے اور انسان کو وہ جذبہ تحرک عطا نہیں کر سکتی جو اسے اتنے بڑے ایثار پر آمادہ کر سکے (اور التزاماً اور دواماً آمادہ کرتا رہے) کہ وہ نہایت جگر کاوی سے دن رات محنت کرے اور اس کے ماحصل میں سے صرف اپنی کم از کم ضروریات کے مطابق لیکر باقی سب، مفلوک الحال محتاجوں کے لئے بطیبِ خاطر دیدے۔ یہ صرف قرآن کے پیش کردہ معاشی نظام میں ممکن ہے جو سرمایہ داری کے خلاف کمیونزم سے بھی دس قدم آگے جاتا ہے۔ انہیں بتایا جائے کہ انسانیت کا مستقبل کس طرح قرآن کے معاشی نظام کے ہاتھوں میں ہے

فنونِ لطیفہ

ہمارے طالب علموں کے لئے سب سے زیادہ پریشان کن مسئلہ فنونِ لطیفہ کا ہے۔ وہ مذہب کی طرف آتے ہیں تو وہاں انہیں ـــــ موسیقی اور مصوری تو ایک طرف ـــــ کھل کر ہنسنے کی بھی اجازت نہیں دی جاتی۔ اسے خلافِ شریعت بتایا جاتا ہے۔ دوسری طرف وہ دیکھتے ہیں کہ ہر شہر میں سینکڑوں سینما ہال ہیں جن میں حکومت سے سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے بعد عریاں سے عریاں اور فحش سے فحش تصاویر ہفتوں، مہینوں، سالوں چلتی رہتی ہیں۔ بیرونِ ملک سے ایسے رسائل اور جرائد سیلاب کی طرح امنڈے چلے آتے ہیں جن میں سوقیانہ فحاشی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ یہ تماشا بھی دیکھتے ہیں کہ بعض مقامات پر حکومت کے ذمہ دار عمال، کلچرل شو کے نام پر، رقص و سرود کی محفلیں منعقد کراتے ہیں۔ لیکن جب مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ایک ہلکی سی ملتی ہے تو اپنے دفتر کی کرسیوں کے نیچے دبک کر جا چھپتے ہیں۔ ملک میں ۔ ۔ ۔ ۔ ہیجان خیز تصاویر اور لٹریچر کی بھرمار ہوتی ہے اور ہمارا نوجوان اس دوراہے پر ششدر و حیران کھڑا رہتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کہے اور کیا نہ کرے۔ ایک طرف وہ اپنے آپ کو اس فضا میں پاتا ہے جو فحاشی کے جراثیم سے معمور ہے۔ دوسری طرف اس پر اظہارِ جذبات کی متوازن راہیں بھی مسدود ہوتی ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ کہ وہ جنسی بدنہادی (Sex- Perversion) کا شکار ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشرہ میں کوئی شریف لڑکی کسی راہگذر میں اپنے آپ کو محفوظ نہیں پاتی۔ اور ڈری، سہمی ہوئی گھٹن میں زندگی گزار دیتی ہے۔ ان نوجوانوں کی تعلیم اس انداز سے ہونی چاہیئے جس سے ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اُن حدود کے اندر رہتے ہوئے جو وحی کی مستقل اقدار عاید کرتی ہیں، اسلام، فنونِ لطیفہ کے ذریعے اظہارِ جذبات سے نہ صرف یہ کہ روکتا نہیں بلکہ اسکی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

جب فنونِ لطیفہ کے متعلق ہماری مذہبی پیشوائیت کا اندازۂ نگاہ یہ ہے تو جنسیات کے متعلق اس کا ردِ عمل ظاہر ہے۔ ان کے نزدیک یہ وہ شجرِ ممنوعہ ہے جس کے متعلق ایک حرف تک زبان پر لانا بھی گناہ کبیرہ سے کم نہیں (اگرچہ ان کے اپنے ہاں، "شرعی مسائل" کی آڑ میں، جنسیات کے تذکرے، جلوت و خلوت میں، باعثِ گرمیٔ محفل بنے رہتے ہیں) زندگی کے ایسے اہم اور بنیادی مسئلہ کو اس طرح نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے کہ ہمارے طالب اس موضوع پر چوری چھپے مغربی افکار و تجارب کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں اور یوں (غیر شعوری طور پر) غلط روی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ جنسیات

کے متعلق قرآن کا تصور ان کے ذہن نشین کرایا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ شرفِ انسانیت کے حصول کے لئے قلب و نگاہ کی عصمت کس قدر لابفک ہے۔ دوسری طرف لڑکیوں کو بھی ان کے صحیح مقام سے متعارف اور ان کے فرائضِ حیات سے آگاہ کیا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ نوعِ انسان (MANKIND) مرد اور عورت دونوں سے مرکب ہے اور ایک جنس کو دوسری جنس پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ لہٰذا، انہیں اپنے دل سے اس احساسِ کمتری کو نکال دینا چاہیئے جس کا اسے صدیوں سے شکار بنا دیا گیا ہے اور جس کی وجہ سے وہ اس فریب میں مبتلا ہیں کہ انہیں صرف مردوں کا کھلونا بنا کر بھیجا گیا ہے

اسلامی تاریخ

ہمارے نصابِ تعلیم میں سب سے اہم حصہ اسلامی تاریخ کا ہے۔ اس سلسلہ میں، سب سے پہلے طالبعلموں کو بتانا چاہیئے کہ مسلمانوں کی تاریخ اور اسلام کی تاریخ میں کیا فرق ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں اسلام کی تاریخ کا الگ تصور ہی نہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی تاریخ کو اسلام کی تاریخ سمجھ لیتے ہیں اور اس سے بہت سی غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

جہاں تک ہمارے قرنِ اول (عہدِ نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ) کی تاریخ کا تعلق ہے اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے ہماری کتب سیرت اور تاریخ میں ایسی ایسی روایات راہ پا گئی ہیں جن سے حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ (معاذ اللہ) بڑی داغدار ہو جاتی ہے اور صحابہ کبارؓ کی زندگی کا عجیب سا نقشہ سامنے آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہماری تاریخ کا وہ حصہ جس میں اس قسم کے واقعات درج ہیں، وضعی اور ناقابلِ اعتبار ہے۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت کا اس باب میں مسلک عجیب ہے۔ یہ لوگ روایت پرستی کے چنگل میں اس درجہ جکڑے ہوئے ہیں کہ وہ اسے تو گوارا کر لیں گے کہ حضورؐ نبی اکرم کی یا صحابہؓ کی سیرت داغدار ہو جائے لیکن اسے برداشت نہیں کریں گے کہ ان کتبِ سیر و تاریخ کے مؤلفین کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ انہوں نے غلطی سے اس قسم کی وضعی روایات کو اپنے ہاں درج کر دیا ــــ ضرورت ہے کہ ہم اپنی تاریخ کے اس حصے پر قرآن کریم کی روشنی میں نظرِ ثانی کریں اور اس میں سے اس قسم کے تمام قابلِ اعتراض حصوں کو خارج کر کے، سیرۃ رسولؐ اور صحابہؓ کو منزہ اور پاکیزہ صورت میں طلباء کے سامنے پیش کریں۔

روایت پرستی کے سلسلہ میں دوسری چیز اسلاف پرستی کی سامنے آتی ہے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت کا مسلک یہ ہے کہ اسلاف کے ہاں، کوئی بات خواہ قرآن کریم کے صریح خلاف یا علم و عقل اور واقعات و

مشاہدات کے یکسر نقیض ہو۔ آپ اس پر حرف گیری نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اسلاف غلطی سے مبرّیٰ تھے۔ اور اُن کا زمانہ، علم و عقل اور فکر و بصیرت کے اعتبار سے ہمارے زمانے، اور ہر آنے والے زمانے سے کہیں آگے تھا۔ اس اسلاف پرستی کا نتیجہ یہ ہے کہ جو غلطی کسی وقت ہو گئی وہ آنے والوں کے لئے سند قرار پا گئی اور اب آپ کا علم لاکھ کچھ کہے اور دنیا کے انکشافات و تحقیقات کا فیصلہ کچھ ہی ہو، آپ اس غلطی کے خلاف لب کشائی نہیں کر سکتے۔ اس سے مسلمانوں پر علمی ترقی کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں اور اُمت ندرتِ فکر و عمل سے یکسر محروم ہو گئی۔ اب اندھی تقلید ان کا شیوہ اور جمود و تعطل ان کا شعار قرار پا گیا۔ ضرورت ہے کہ ہمارے طالب علموں کو اس قسم کی تعلیم دی جائے جس سے ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ہمارے اسلاف بھی ہماری طرح کے انسان تھے۔ اور زمانہ من حیث الکل علم و فضل کے اعتبار سے آگے بڑھتا جا رہا ہے کسی انسان کا کوئی قول نہ غلطی سے منزہ ہو سکتا ہے نہ تنقید کی حد سے بالا۔ اس لئے ہمیں اپنی عقل و فکر سے کام لینا چاہیئے کسی انسان کا کوئی قول کسی دوسرے انسان کے لئے سند اور حجت نہیں ہو سکتا غلطی سے مبرّیٰ اور سند و حجت صرف خدا کی کتاب ہے۔

ارکانِ اسلام

یہ ظاہر ہے کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ (جنہیں عام طور پر ارکانِ اسلام کہا جاتا ہے) اب بے روح رسوم بن کر رہ گئے ہیں جن کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آتا۔ ہماری مذہبی پیشوائیت کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ ارکان (جس شکل میں بھی ادا کئے جاتے ہیں) مقصود بالذات ہیں۔ اس لئے ان میں نتیجہ تلاش کرنا بے معنی بات ہی نہیں بلکہ دین میں گستاخی کے مرادف ہے۔ ان سے مقصود، حصولِ خوشنودیٔ باری تعالےٰ ہے اور یہی ان کا نتیجہ ہے جو آخرت میں جا کر سامنے آئے گا۔ ہمارا نوجوان طبقہ اس سے مطمئن نہیں ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ وہ ان ارکان کا پابند نہیں رہا۔ مذہبی پیشوائیت اس سے ان ارکان کی پابندی ڈنڈے کے زور سے کرانا چاہتی ہے اور نہیں سمجھتی کہ اس سے یہ طبقہ مذہب کی طرف سے برگشتہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہوتا جا رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان طالب علموں کو یہ بتایا جائے کہ یہ ارکان درحقیقت اسلام کے نظامِ حیات کے اہم اجزاء ہیں اور اس نظام میں اس کے جیتے جاگتے نتائج درخشندہ و تابندہ طور پر سامنے آجاتے ہیں اب چونکہ وہ نظام باقی نہیں رہا اس لئے اس کے یہ اجزاء مشینری سے الگ پڑے ہوئے پرزوں کی طرح بے نتیجہ نظر آتے ہیں، جب اسلام کا نظام پھر سے قائم ہو گا تو یہی ارکان، پھر وہی نتائج مرتب کرنے لگ جائیں گے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کا پورا نظامِ حیات اور اس میں ان ارکان کا صحیح مقام

ان کے سامنے لایا جائے۔

یہ ہیں ہمارے نزدیک اس نظامِ تعلیم کے نمایاں خط وخال جس سے ہمارے طالب علم قابلِ فخر انسان بن سکیں گے اور جب ان انسانوں پر مشتمل قوم دنیا کے سامنے آئے گی تو وہ (دنیا) خود دیکھ لے گی، کہ صحیح اسلامی تعلیم وتربیت کے برگ وبار کس قسم کے ہوتے ہیں اور پاکستان کی مملکت کس مقصد کے لئے وجود میں لائی گئی تھی۔ اگر اس نظام کو اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا جائے تو اس کے مطابق کتابیں بھی تیار کی جا سکتی ہیں۔ لیکن آپ نے تصریحاتِ بالا سے دیکھا ہوگا کہ اس نظام کے لئے کتابوں سے کہیں زیادہ اہمیت معلمین (اساتذہ اور پروفیسرز) کی ہے۔ یہ معلمین اس قابل ہونے چاہئیں کہ وہ کوئی مضمون پڑھائیں، اپنے طلباء کے ذہن میں اس حقیقت کو اجاگر کرتے جائیں کہ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے اور مسلمان کی حیثیت سے ان کا فریضہ کیا۔ اس مقصد کے حصول اور اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے مستقل اقتدارِ خداوندی کیا کردار ادا کرتے ہیں اور جو مضمون انہیں پڑھایا جا رہا ہے وہ کس حد تک اور کس انداز سے اس مقصد کے حصول میں ممد ومعاون ہو سکتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ تبدیلی ایک دن میں نہیں ہو سکتی۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ کیا ہمارے اربابِ نظم ونسق اس قسم کی تبدیلی چاہتے ہیں؟ اگر وہ اس قسم کی تبدیلی چاہتے ہوں تو اس کے متعلق اصولی طور پر فیصلہ کر کے، اس نصاب کو بطور نصب العین سامنے رکھ لینا چاہیئے اور پھر اس نصب العین تک پہنچنے کے لئے بتدریج کوشش کرنی چاہیئے۔ اسلامی تعلیم کوئی ٹیکنیکل سبجکٹ نہیں جسے آپ ایک خاص پیریڈ میں الگ تھلگ طور پر پڑھا دیں۔ اسے تو پورے نظامِ تعلیم میں خونِ زندگی کی طرح گردش کرنی چاہیئے جس طرح آپ ایک زندہ انسان کے جسم میں یہ نہیں بتا سکتے کہ اس کی جان کہاں ہے اسی طرح آپ اس نظامِ تعلیم میں اس کی نشاندہی نہیں کر سکیں گے کہ اس کے فلاں حصہ کا نام اسلامی تعلیم ہے — اسلامی تعلیم نام ہے ایک خاص فضا پیدا کرنے کا — طالب علموں کے زاویۂ نگاہ میں ایک خاص تبدیلی پیدا کرنے کا — ان کے قلب ودماغ کو ایک خاص پیکر میں ڈھالنے کا — اور ظاہر ہے کہ یہ کام صرف کتابوں سے نہیں ہو سکتا — کتابیں، اسلامی نظامِ حیات کے تصور کو نمایاں کر سکیں گی لیکن اس تصور کو علم کے ہر شعبہ اور زندگی کے ہر گوشے میں سمو دینا، اساتذہ کا کام ہے۔ یہ ہے وہ طریق جس سے اسلام، ہماری نئی نسل کے لئے غایتِ حیات بن سکتا ہے اور اسی سے حصولِ پاکستان کا مقصد پورا ہو سکتا ہے۔

لیکن — جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے، اس نظام کے اختیار اور نافذ کرنے کے لئے

بڑی قلندرانہ جرأت کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے کہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوگی اور نظامِ سرمایہ داری کے حاملین ان کی پشت پر ہوں گے

تقسیم ہند سے پہلے مذہبی پیشوائیت کی حیثیت انفرادی تھی۔ لیکن یہاں اس نے منظم شکل اختیار کرلی ہے اور وہ اپنی طاقت دن بدن بڑھائے چلی جارہی ہے۔ آپ آج کا موازنہ تقسیم ہند کے زمانے سے کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس وقت کے مقابلہ میں آج یہاں مذہبی پیشوائیت کا تسلط ہزار گنا زیادہ ہے ـــــ ہر محلہ میں مکتب، ہر شہر میں دارالعلوم، ہر چار قدم پر مسجد اور اس میں چار چار لاؤڈ اسپیکر، ہر روز کوئی نہ کوئی تقریب اور ہر شب کوئی نہ کوئی محفل ـــــ ان کی ایک ایک انجمن اور ایک ایک جماعت کا بجٹ دیکھئے تو انکے بجٹ کا مجموعی میزان کروڑوں سے تجاوز کر جائے گی ـــــ ان کی اپنی کوششیں ہی کم نہ تھیں کہ محکمۂ اوقاف نے "سمندِ ناز پہ اک اور تازیانے" کا کام کیا اور خود حکومت کے زیرِ اہتمام مذہبی پیشوائیت کی آبیاری ہونے لگی۔ آپ سوچئے کہ ان حالات میں یہاں صحیح اسلامی علم کی روشنی پھیلانا، اور عقل کے چراغ جلانا کس قدر مشکل کام ہے۔ اس کے لئے واقعی قلندرانہ جرأت کی ضرورت ہے۔

یہی تھے وہ حالات، جن کے پیشِ نظر ہم نے ہار تھک کر یہ فیصلہ کیا کہ اپنی درس گاہ قائم کرکے، اس نظامِ تعلیم کا تجربہ کیا جائے۔ شاید اس کے نتائج، اس نظام کو ملک گیر بنانے کے لئے معاشرہ کو آمادہ کرسکیں۔

بہرحال، یہ ہے اس نظامِ تعلیم کا انگارہ (خاکہ) جسے ہم اپنی بصیرت کے مطابق نئی نسل کو صحیح اسلامی قالب میں ڈھالنے کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اسے ہم بطورِ اتمامِ حجت شائع کر رہے ہیں۔ بایں امید کہ شاید، اسی گرد میں سے کوئی ایسا شاہسوار نکل آئے جو ہماری نئی نسلوں کو صحیح راستے پر لانے کے لئے ہمت کرلے اور یوں ـــ "خود تقدیرِ یزداں" ـــ بن کر اس متاعِ بردہ امت کی تقدیر بدلنے کا سامان پیدا کردے ـــــ

ـــــ کتنی حسین ہے ہماری یہ آرزو ـــــ

معذرت

ہمیں افسوس ہے کہ کنونشن کے بعد ناظم ادارہ، محترم صفدر سلیمی صاحب کی ناسازیٔ طبع کی وجہ سے احباب کے خطوط کے جوابات اور فرمائشوں کی تعمیل میں تاخیر ہوگئی ہے اسکے لئے ہم معذرت خواہ ہیں

کنونشن میں تقریر!

..... یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا کہ پہلی بار آپ سے مخاطب ہونے کا موقعہ ملا، غریب شہر مدت سے سخنہائے گفتنی لئے لئے پھرتا تھا، بارے کسی نے اس کی باتوں کو سننے کے قابل سمجھا اور ان پر توجہ دی۔ اس بات کو ایک سال گذر چکا ہے۔ ایک عہد آفریں سال، ایک ایسا سال جو اپنے دامن میں وہ کچھ لے کر آتا ہے جسے قومیں سرمایہ حیات بناتی ہیں۔

پہلی بار اپنے شکوک و شبہات کی داستان لے کر آپ کے پاس آیا تھا، للہ الحمد کہ بہت سی باتوں سے شک و شبہ کا وقت گزر چکا ہے، توہمات کے بہت سے جالے تارِ عنکبوت بن کر رہ گئے ہیں۔ خدا کے کلام کو سننے، سمجھنے کا جو موقعہ ملا، یہ سعادت جو نصیب ہوئی تو ذہن جیسے بے یقینی کے دھندلکوں شکوک و شبہات کی تاریکیوں سے نکل کر روشنی میں آ گیا۔

دنیا کا یہ ہنگامہ ایک کھیل ہے جو آسمان پر بیٹھا کوئی محض دل بہلاوے کے لئے کھیل رہا ہے، انسان اس کے ہاتھوں میں کھلونے ہیں بے دست و پا، جنہیں وہ ہاتھ سے بناتا اور پاؤں سے توڑتا جاتا ہے۔ یا یہ کارگہہ ہست و بود کسی سوچے سمجھے منصوبے کے ماتحت اپنی کسی منزل کی طرف رواں دواں ہے ___ سائنس کے کھیل شیطانی کارنامے ہیں، خدا کی حکمتوں میں دخل دینے کی گستاخی ہے، زمین کے نیچے اور آسمانوں میں، خلاؤں میں چھپے بھیدوں کی تلاش، انسان کا تسخیر فطرت کا عزم تباہی کا پیغام ہے۔ یا انسان کی اپنی کوششوں کی ایک کڑی ہے جس میں وہ ازل سے مصروف ہے جس کا اس نے یوں اظہار کیا ہے۔ ؎

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم

یہ اس کی بے راہ روی ہے یا وہی تڑپ ہے جو لے کر وہ روزِ اول چلا تھا، یہی اس کی اس عظمت و

بزرگی کی مظہر ہے جس کے سامنے کائنات کی تمام قوتیں اس کے آگے سجدہ ریز ہوئی تھیں۔

بزرگان دین کچھ کہتے تھے، عقل کچھ اور، جب کبھی ان کی عظمت، ان کا جاہ وجلال دل کو لبھاتا کہ ـــــ ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند ـــــ تو ذہن کے گوشوں میں آباؤ واجداد کا دیا ہوا مذہب کفر سے ڈرا کر سہما دیتا۔ اور سہمی ہوئی، ڈری ہوئی زندگی ان کی طرف دیکھتی جو کائنات کی بلندیوں اور پستیوں پر چھائے ہوئے تھے، جنہیں تمکن فی الارض حاصل تھا، جنہیں وہ سب کچھ فراوانی سے میسر تھا جسے خدا اپنے انعام کے مظہر کہتا ہے۔ ـــــ رزق کی فراوانی، لہلہاتے ہوئے کھیت اور سبزہ زار، بہتی گنگناتی ندیاں، جاہ وجلال، قوت و جبروت، اقتدار، تو دل میں ایک حسرت سی سلگنے لگتی کہ کاش یہ انعام ایمان پانے والوں کی قسمت بھی لکھے ہوتے۔

یہ بادل چھٹ گئے، اندھیرے دور ہو گئے، اجالوں میں ہر چیز اصل رنگ پہ آجاتی ہے، اسرار اسرار نہیں رہتے ـــــ دیکھا تو بعید کھلا کہ ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

تاریخ کے ورق الٹے تو ان لوگوں سے ملاقات ہوئی جنہوں نے تنگیٔ داماں کا علاج ڈھونڈ لیا تھا، وہ جو دیکھتے ہی دیکھتے بلند و پست پہ چھا گئے تھے، وہ پُراسرار لوگ جنکی ہیبت سے پہاڑ سمٹ جاتے تھے، اور صحرا و دریا جن کے قدموں سے لرزتے تھے ـــــ ان بندوں کے محیر العقول کارنامے پڑھ کر ذہن حیران ہوتا تھا۔ یا اللہ! یہ کیسے لوگ تھے، خوف جن کے قریب بھی نہ پھٹکتا تھا، وہ کون سے عزم و یقین کی دولت سے مالا مال تھے کہ وسائل کی کمی کے باوجود باطل کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے تھے ـــــ ہاں سینہ سپر ہو جاتے تھے، بارہا پڑھا تھا کہ ایسے ایسے لشکر جن میں شامل سپاہیوں میں کسی کے پاس سواری تھی تو کوئی اس کے بغیر ہی تھا۔ کسی کے پاس نیزہ تھا تو ڈھال نہ تھی۔ تلوار تو تھی مگر سینے پر زرہ نہ تھی۔ اور وہ زرہ کے بغیر ہی ایسے لشکر کے سامنے سینہ سپر تھے جس کا ایک ایک سپاہی سر سے لے کر پاؤں تک گویا فولاد میں مڑھا ہوا تھا ـــــ!

عقل حیران ہوتی تھی جب تاریخ کی کتابیں یہ کہتی تھیں کہ یہ بے سروسامان لوگ ساز و سامان سے لدے پھندے لشکروں پر حاوی رہے! ـــــ اس مادی دور میں پلا بڑھا شخص حیران و ششدر ہی نہیں شکوک و شبہات میں بھی مبتلا ہو جاتا کہ اس میں یا کوئی بھید ہے، یا ان بیانوں میں کوئی مبالغہ آرائی ہے ـــــ مگر تاریخ کی حقیقتوں کو جھٹلایا بھی تو نہیں جا سکتا۔ تاریخ کی حقیقتیں جنہیں خود خدا گواہ ٹھہرا

ہے ـــ اور حق و باطل کی لڑائیوں کے نتیجوں کی تاریخ گواہ ہے ـــ

مذہبی بزرگوں کا فرمان تھا فرشتے ساتھ لڑتے تھے ـــ عقل حیلہ جو اگر یہ کہتی کہ پھر ان کا کمال کیا ہوا۔ تو ہم ایسے مورد عتاب اور گردن زدنی قرار دے دیتے۔ مگر یہ خدائی یقین دہانیاں کہ اگر تم میں بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو پر غالب آجائیں گے اور سو آدمی ایسے ہوں تو ہزار پر غالب آجائیں گے کس طرف اشارہ کرتی ہیں۔

اس گئے سال نے یہ نظارہ بھی دکھلا دیا کہ آج بھی ایسا ممکن ہے۔ ہمارے شیر دل مجاہدوں کی ہمت استقامت، صبر و استقلال، شجاعت و دلیری آج ایک دنیا کو حیران کر گئی، کیا آج بھی ایسا ممکن ہے کہ ایک طرف فولادی ہاتھیوں کا پورے کا پورا بیڑا، فولادی گاڑیوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، اَن گنت کیل کانٹے سے لیس سپاہی، قطار در قطار، لہر بہ لہر ـــ ایمان و عزم کی سیسہ پلائی ہوئی دیوار سے سر ٹکرا ٹکرا کر پلٹ جانے پر مجبور ہوتے رہے۔ اور جب یہ طوفان بلاخیز تھک ہار کر بیٹھ گیا تو دنیا نے دیکھا کہ اس ٹڈی دَل کے مقابلہ میں تو اس سے کئی حصے کم، کئی نسبت بے سروسامان فوج تھی، ستمبر کی جنگ نے قرونِ اولیٰ کے قصوں کو سچ کر دکھایا۔ اس نے ثابت کر دیا کہ اگر فضائے بدر پیدا کر دی جائے تو آج بھی آسمانوں سے فرشتوں کا نزول ہو سکتا ہے۔

صبر و استقلال، عزم و ہمت، شجاعت و دلیری کے ان پیکروں کے اس بے مثال کردار کو بھی ایک دنیا نے دیکھا کہ اس سارے معرکے میں، دشمنوں کو، اور دشمن بھی وہ جو مثالی جھوٹا اور افترا پرداز ہے، یہ کہہ سکنے کی جرأت نہ ہو سکی کہ ان مجاہدوں میں سے ایک سے بھی وہ حرکت سرزد ہوئی ہو جو رام کی ماننے والی اس قوم کے راونوں نے ہمارے ساتھ روا رکھی۔

یہ نوجوان کون تھے؟ یہ نوجوان کون ہیں؟ وہ کس قوم کے افراد تھے، جنہوں نے گھروں کے دروازے دوسروں کے لئے کھول دیئے، جنہوں نے اپنی کمائی کا بیشتر حصہ اپنے بھائیوں کے لئے دے ڈالا، وہ جنہوں نے اپنے کفن کے پیسے بھی قوم کو دے دیئے ـــ کیسے ایکا ایکی سب اختلاف مٹ گئے۔ کیونکر دیکھتے دیکھتے ـــ جو خطا کار تھے باصفا ہو گئے ـــ کس جذبے نے یہ انقلاب برپا کر دیا۔

حاضرین! یہاں تھوڑی سی دیر کے لئے اپنی ذات کو درمیان میں لا رہا ہوں۔ معذرت خواہ ہوں مگر مجبور ہوں، اپنی بات کو شاید اس طرح واضح کر سکوں۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں ـــ ہے رگِ ساز میں نہاں صاحبِ ساز کا لہو ـــ میں افسانہ نویس ہوں، کہانیاں لکھتا ہوں ـــ کہانیوں میں مختلف کردار ہوتے ہیں، کبھی کبھی یوں ہوتا ہے ـــ جو آپ میں سے اس فن کے واقف ہیں شاید تصور کر سکیں ـــ کہ آپ کا کوئی بڑا

ہی المیہ کردار آنکھوں میں آنسو بھرے آپ کے سامنے آن کھڑا ہوتا ہے کہ مجھ پر یہ ظلم کیوں کرتے ہو، میرا کردار تمہی نے تعمیر کیا ہے۔ اسے اس پس منظر میں نہ ابھارتے تو میں کبھی ایسا نہ ہوتا، تم کبھی ایسا نہ کر سکتے۔ یا کوئی بڑا ہی بُرا سا کردار کسی بڑی ڈرامائی صورت حال میں نیکی اور قربانی کا عظیم مظاہرہ دکھا کر آپ سے کہے، دیکھا تم مجھے اس قدر بُرا بنا رہے تھے، یہ ذرا حالات بدلے اس صورت حال نے مجھ سے ذرا سا اس کا تقاضا کیا اور میں نے اپنے اصلی کردار کا یہ تابناک رُخ دکھا کر تمہیں ہی نہیں ایک دنیا کو حیران کر دیا ــــ"

بس یہی حال ہماری قوم اور اس کے نوجوان طبقے کا ہے، ہم آئے دن ان پر طعن و تشنیع سنتے ہیں، ان کی بے راہ روی کا رونا روتے ہیں، ان میں کردار کی کمزوری اور لغزشوں کی فراوانی کا ذکر کرتے ہیں ــــ مگر کبھی یہ نہیں سوچتے کہ اس کا ذمہ دار کون ہے۔ ہم نے انہیں کیا ماحول دیا، ہم نے انہیں کیسی تعلیم، کیسی تربیت دی، ہم نے انہیں عملاً کس طرح پروان چڑھایا، اپنے کردار و عمل سے ان کے سامنے کیا نمونہ پیش کیا، اس نسل کا المیہ بس یہی ہے کہ ان کا فہم زیادہ تیز ہے، ان سے کچھ ڈھکا چھپا نہیں رہ سکا ــــ اور پھر جو معاشرہ ہم نے انہیں بنا کر دکھایا ہے، جو کچھ ان کے سامنے ہوش سنبھالتے اردگرد ہوتا رہا، اس سے انہیں بے خبر رکھا بھی کیسے جا سکتا تھا۔ انہوں نے ایک انقلابی دور میں آنکھ کھولی، ان کا شعور بیدار ہوا تو انہوں نے اپنے اردگرد ایک طوفانِ دار و گیر دیکھا، سلب و نہب، نفس و نفسی کا عالم ــــ انہوں نے ہر لمحہ یہ سمجھا ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے

ہر کوئی دوڑ رہا ہے، پریشان ہے، صبح سے شام تک یا تلاشِ معاش میں، یا رزق کے حصول کے لئے جگر پاش مشقتوں میں ہے یا پھر وہ لوگ ہیں جو رزق کو زیادہ سے زیادہ اپنے ہاتھ میں سمیٹ کر دوسروں کو زیادہ سے زیادہ اپنا دست نگر اور محتاج بنانے پر تلے بیٹھے ہیں۔ ان کے اردگرد دیکھتے ہی دیکھتے وسیع و عریض بنگلے، عظیم الشان محل تعمیر ہو گئے۔ فیکٹریاں، کارخانے، بنک، بجلی گھر اور خدا جانے اور کیا کیا کچھ تعمیر ہوتا رہا ــــ حکومتیں اور ان کے نقیب کہتے رہے ملک میں خوش حالی ہو رہی ہے، سامانِ زیست بلکہ سامانِ تعیش فراوانی سے مل رہا ہے۔ وہ دن قریب ہے کہ ہر کسی کو ہر شے میسر ہو سکے گی۔ یہ وعدے پیاسے کے لئے ایک سراب سے زیادہ ثابت نہ ہوئے، معاشرہ اسی چکر میں چلتا رہا۔ ہر کوئی اپنی اپنی فکر میں مبتلا، عرصۂ محشر کی طرح، نہ والدین کو بچوں کی فکر اور نہ بچوں کو والدین کا خیال اور یوں نئی نسل بیچاری کھوئی کھوئی اس عرصۂ محشر میں محلات، کارخانوں، ملوں، بندوں کے درمیان یوں پھرتی رہی جیسے کوئی بچہ ماں باپ سے بچھڑ کر میلے کی بھیڑ میں کھو گیا ہو اس کی آنکھوں میں آنسو ہوں۔ اس کا دل بھاری ہو۔ اس کے پاؤں میں تھکن ہو۔ وہ ہر قدم پر رہنمائی کے لئے دیکھے، مگر کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہو۔ کوئی دولت کے جھولوں میں جھول رہا ہو

کوئی معاش کے چکر میں سرگرداں، اور یہ بیچارہ مارا مارا پھرتا اٹھائی گیروں کے چنگل میں پھنس گیا جس نے اسے ..... اپنوں سے بدظن کر کے اپنے ہی طور پر ڈھالنے کے لئے اسے نئے نئے طلسم دکھائے، اسے پہلے اپنے پیسے پر پالا پوسا اور پھر اپنی ہی ڈگر پر ڈال کر اسکے کھوئے ہوئے والدین اور معاشرے کے لئے ایک مسئلہ بنا کر رکھ دیا۔ اور اب یہ والدین اپنے بچے کو اپنانے کے لئے بھی تیار نہیں، وہ اُسے اٹھائی گیروں کا بچہ کہہ کر بری الذمہ ہو جانا چاہتے ہیں۔ یوں اپنی غفلتوں اور کوتاہیوں پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں اور اس کو کبھی طعن و تشنیع کے ہتھیاروں سے، کبھی پولیس کی قانون کی جکڑ بندیوں سے ڈرا کر راہ راست پر لانا چاہتے ہیں۔

اور یا دش بخیر ایک اور گروہ ہے جو ان کی کچھ اس طرح اصلاح کرنا چاہتے ہیں، جیسے کوئی ناسمجھ طبیب تشخیص کے بغیر ہی علامات کو بیماری سمجھ کر علاج شروع کر دے۔ جسم پر کہیں کوئی دانہ نکل آیا ہے۔ نشتر لگا دو، جلد پہ داغ پڑ گئے ہیں کسی خوشنما چیز سے ڈھانپ دو۔ بخار ہو رہا ہے سر پر ٹھنڈی پٹیاں رکھ دو اور مطمئن ہو کر بیٹھ جاؤ۔ اس گروہ کے حواریوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں ـــــ فحاشی کے اڈے بند کر دو (اس کے محرکات سے انہیں کچھ سروکار نہیں) فلموں میں جو کچھ ہوتا ہے ہوتا رہے، اس کے عریاں اشتہار بند کر دو، ریس، جوئے اور شراب پر اور نہیں تو رمضان میں پابندی لگا دو ـــــ گداگری قانوناً ختم کر دو، مگر جس محنت کش کو دن بھر خون پسینہ ایک کرنے کے باوجود خاندان کے افراد کے لئے روٹی بھی میسر نہ ہو سکے، اس کے دکھ کا مداوا کرنے کے متعلق قطعاً نہ سوچو (کہ یہ خدا کی خدائی میں دخل ہوگا) نئی نسل کی بے راہ روی کا یہ علاج ہے کہ تنگ کپڑوں پر پابندی لگا دو، مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ انہیں دینیات کی تعلیم بھی دو ـــــ سورتیں زبانی یاد کراؤ، ان کے فضائل بیان کرو، ان کے ورد کی برکتیں بتاؤ اور پھر ولیوں، بزرگوں اور پیرانِ خانقاہ کے محیر العقول بلکہ مافوق الفطرت کارناموں کا قائل کر کے اس کے پر کاٹ دو ـــــ

اگر ان صاحبانِ منبر و محراب اور ان کے حواریوں کے پاس ان کے لئے اس کے سوا اور کچھ نہیں تو ان سے گلہ بھی فضول ہے۔ ان بیچاروں کے پاس اور ہے بھی کیا۔ سوچ، سمجھ، تجسس، فکر، سائنسی تفتیش و تحقیق کو جنم دینے والی ان تمام صلاحیتوں کو مفلوج کر کے اپنی شعبدہ بازی کا قائل کرنا ان کے نزدیک بزرگی کا کمال ہے ـــــ نئی نسل کی بے راہ روی کا علاج ان کے پاس یہی ہے کہ وہ ان کے تتبع میں خانقہی اختیار کر لیں (اب تو خانقاہوں کو اس اسلامی مملکت میں سرکاری Recognition سند مل چکی ہے)

جنگ کے دنوں میں انہیں اپنے لئے میدان نظر آیا تو انہوں نے لوگوں کی ضعیف الاعتقادی سے

فائدہ اٹھاتے ہوئے سبز پوشوں، سفید عماموں والوں کے قصے مشہور کئے اور پھر پرانے مزاروں اور پرانی گدیوں پر قوم کو جھکانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ (اگر حق کو ان فرشتوں اور ان سبز و سفید عماموں والوں ہی کے دم قدم سے فتح مند ہونا ہوتا تو حنین کے میدان میں لڑائی کا پانسہ کیوں پلٹا اور احد کے میدان میں کائنات کی سب سے عظیم ہستی نے زخم کیوں کھائے۔)

ان کے پراپیگنڈے کا یہ اثر تو ہوا کہ ریڈیو پر محافلِ میلاد ہوئیں، قرأت کے مقابلے ہوئے، سیکرٹریوں، وزیروں، درباریوں نے دینی تعلیم، اور دین کی طرف توجہ کی اہمیت پر تقاریر کیں اور یہ حضرات میدان تیار کرنے لگے کہ ان کے بے مثل تعاون اور دعاؤں کے طفیل جو کامیابی حاصل ہوئی اس کے بدلے میں حکومت پھر سے پرسنل لاء بھی ان کے سپرد کر دے اور رویتِ ہلال بھی۔ حکومت اور اس کے کارندے ان کے جبّہ و دستار سے مرعوب ہو کر یا مصلحتاً خاموش رہتے ہیں بلکہ ان کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں، تعجب ہے کہ ان میں ایک بھی ایسا شخص نہیں جو ڈٹ کر یہ کہہ سکے کہ یہ ثنویت دین کی تکذیب ہے۔ جب یہ ایک اسلامی مملکت ہے، اس کا ایک مرکز ہے تو وہی مرکز رویتِ ہلال کا فیصلہ کرے گا اور وہی پرسنل لاء کا۔ کیوں کہ یہ اس کے فرائض میں سے ہے اور جو اس کو تسلیم نہ کرے گا وہ ملکی قانون کو توڑنے اور مرکز سے انحراف کا مرتکب ہوگا مگر حکومت بظاہر ان کے سامنے اسی طرح بے بس ہے جس طرح کارخانہ داروں کے ہاتھوں جو چیزوں کی قیمتیں مقرر کرنے میں خود مختار معلوم ہوتے ہیں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا اگر یہ سب اس گروہ کی طرف سے ہوتا تو کوئی ایسی بات نہ تھی مگر رونا تو اس بات کا ہے کہ حکومت اپنے بے پایاں وسائل کے باوجود اپنی بات کو منوانے کے لئے دلائل و براہین کا نہیں آتش و آہن کا سہارا لیتی ہے، اپنے ان بچوں کے معاملے میں بھی جن کی بے چینی، جن کے اضطراب، جن کے تجسس کا حل، جن کے آزار کا مرہم ان کے اور انہی کے بس کی بات ہے ——— اور وہ ہے ان کی تعلیم کا ایسا انداز جس میں ان کے ذہن کو ایسے سانچے میں ڈھالا جائے، کہ وہ ہر غلط چیز کو رد کر دے۔ تحریص و ترغیب کے ہر جال سے دامن بچا کر نکل جائے ——— تعلیم کے دوران وہ علم کی گہرائیوں تک پہنچ پائیں، سائنس کی سب دقیق گتھیاں ان کے ذہنِ رسا کے سامنے ہیچ ہو جائیں، مغرب کی وہ برتری جو اسے علم میں حاصل ہے اور جس برتری کے بل بوتے پر وہ اپنی تہذیب، اپنا کلچر اور روایات، اپنا لباس اپنی موسیقی، اپنا لہو و لعب سب ہم پر دانستہ و نادانستہ مسلط کر رہا ہے اس سے چھن جائے اور پھر ہم اسے بتا سکیں کہ یہ تسخیر کائنات تو ٹھیک ہے مگر اس کا مقصد کچھ اور ہے، یہ قدرت کے اسرار، یہ زمین کے خزانوں کا علم، یہ سمندروں کی تہوں میں چھپے بھیدوں کا کھوج سبھی اپنی جگہ لائق تکریم و تحسین ہیں۔

لیکن اس کا مقصد بنی نوع انسان کی بہتری ہے، بلا امتیاز رنگ و نسل، بلا امتیاز ملک و قوم ـــــ عقل اور خواہشات کو کھل کھیلنے کا موقع دے کر اللہ کی اس زمین پر فساد پھیلانا زندگی کا مقصد نہیں بلکہ خدا کے بتائے ہوئے قوانین کے مطابق زندگی بسر کر کے انسانیت کی اعلیٰ ترین منازل طے کرنا اس کا مقصود ہے۔ ایسے معاشرے کے پاس جب رزق کی فراوانی ہوگی، جب سائنسی علوم کی بہتات ہوگی تو وہ یہ سب، ساری انسانیت کے لئے کھلا رکھے گا، یہ لوگ جب کسی بھوکے ملک کو اناج دیں گے تو سود در سود قرض پر نہیں اور نہ اس سے ان کا مقصد اس ملک کے معاملات میں دخیل ہونا ہوگا، وہ جب دوسروں کو علم کی روشنی دینگے تو اس کے عوض جان گروی نہ رکھیں گے۔ وہ تو یہ سب محض اس لئے کریں گے کہ یہ انسانیت کا تقاضا ہے۔ اس سے دنیا کی اونچ نیچ دور کرنے میں مدد ملے گی اور دنیا سے ناہمواریاں دور کر کے ایک متوازن صحت مند ماحول پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔

پھر بھی ہمارے نوجوانوں نے، انہی مطعون نوجوانوں نے اس دھتکاری ہوئی قوم نے جسے مسلمان کا درجہ دیتے ہوئے بھی ہمارے فقیہہ ہچکچاتے تھے وقت پڑنے پر اسی افسانوی کردار کی طرح اپنے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں سے دنیا کے افق پر روشنی کی ایک نئی کرن ڈال دی، متزلزل ایمان والوں کو مضبوط کر دیا اور اپنے فلسفۂ حیات کی برتری آشکارا کر دی۔

یہ اس لئے ہوا کہ اس وقت ہر ایک نے سمجھ لیا کہ یہ ملک ہے تو ہم ہیں سبھی کچھ ہے۔ اور اگر خدانخواستہ خدانخواستہ اس پر کوئی آنچ آئی تو کچھ بھی باقی نہیں۔ اسی مشترک خطرے نے آپس کے اختلافات ختم کر دیئے۔ اس ملک کے ہر رہنے والے نے اس ملک کو اپنا گھر، اپنا مستقبل سمجھا۔ یہی جذبہ اگر عام حالات میں ہماری قوم میں جاری و ساری رہے تو ہمارے لوگوں کی خفتہ صلاحیتیں، مضمر قوتیں اتنی بڑی تعمیری تحریک بن کر سامنے آسکتی ہیں کہ سالوں کا کام مہینوں میں ہو جائے اور یہ کہنے والے کہ نفع کی تحریک INCENTIVE ہی کسی کو کام پر اکسا سکتی ہے اور کوئی جذبہ یہ کام نہیں کر سکتا۔ دیکھ لیں کہ نفع کی تحریک ہی کو عملاً اجتماعی نفع بنا دیا جائے تو کارکردگی کس درجہ بہتر ہو جاتی ہے۔ ایک مشترک خطرہ اختلافات مٹا سکتا ہے تو مشترک مفاد کیوں اختلافات نہ مٹا سکے گا۔؟

ہاں، مگر اس کے لئے ایثار کا، قربانی کا، وقتی طور پر آسائش و آرام سے محرومیوں کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس ذہین و فطین نئی نسل کے سامنے وعظ کرنے کی بجائے انہیں بہتر زندگیاں جی کر دکھاؤ۔ ان کے سامنے ایسا معاشرہ تشکیل کرو جہاں دولت و ثروت کی بجائے اعلیٰ انسانی قدریں عزت و تکریم کے پیمانے ہوں ـــ ایک منزلِ مقصود ان کے سامنے لاؤ اور خود ذاتی منفعت سے نہیں، شخصی آرام و آسائش سے

بے نیاز ہوکر اس کی طرف رواں دواں ہوجاؤ۔

نئی نسل کے ساتھ ہی ساتھ اس سطح کی ساری قوم پر اس جنگ نے ایک ایسا اثر کیا ہے جسے پہچاننے کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کہ قوم نے اپنے آپ کو دریافت کر لیا ہے شجاعت و مردانگی، بلند حوصلگی، عظیم قربانیوں کی لاتعداد مثالوں کو اپنے سامنے مجسم دیکھ کر قوم نے محسوس کر لیا ہے کہ اسکی مضمر صلاحیتیں کیا کیا ہیں اور اس سے کس کس چیز کی توقع کی جاسکتی ہے ۔

ان مثالوں کے بعد آج قوم ان مثالوں کے لئے پُر امید طور پر چشم براہ ہے جو ہماری تاریخ کا دوسرا محیر العقول پہلو ہے ۔

بیوی نے سرکاری وظیفے میں سے کچھ بچا کر رکھا ہے، خاوند کو جو خلیفۂ وقت ہے معلوم ہوتا ہے تو وظیفے کو اسی قدر کم کر دیا جاتا ہے ۔ سچی بات کہنے وقت حاکم وقت دیا بجھا دیتا ہے کہ اس میں تیل سرکاری خزانے سے پڑا تھا۔ قحط کے دنوں میں خلیفہ اپنے لئے روغن حرام کر لیتا ہے، وہی روکھی سوکھی کھاتا ہے جو ایک عام آدمی کو میسر ہے ۔ پہلے یہ کہانیاں پڑھتے تھے تو تعجب ہوتا تھا۔ انہیں ماننے میں تأمل ہوتا تھا مگر آج قوم پُر امید ہے، آج اسے یقین ہے کہ جہاں اس قسم کے نوجوان ہو سکتے ہیں کہ کلمہ پڑھتے ہوئے سینوں پر ٹینک شکن مائینز باندھ کر ٹینکوں کے نیچے لیٹ جائیں اس قوم کا دامن ایسے منتظموں ایسے انصاف پرور، ایسے خدا سے ڈرنے والے حاکموں سے خالی نہیں ہو سکتا۔

ہم نے دیکھ لیا کہ یہ مٹی بڑی زرخیز ہے، اسے نم کی ضرورت ہے، جو اسے درست تعلیم اور ایک نصب العین عطا کر سکتا ہے ۔

یوم اقبال

بزم طلوع اسلام (لاہور) کے زیر اہتمام ۲۲ اپریل کو یوم اقبال کی تقریب منائی جارہی ہے جس میں پرویز صاحب کے خطاب کا موضوع ہوگا ۔

ابلیس کی مجلس شوریٰ

چونکہ پرچہ کی کاپیاں جلدی پریس میں جارہی ہیں اسلئے ہمیں افسوس ہے کہ اس تقریب کی روئیداد اس اشاعت میں شائع نہیں ہو سکیگی

اظہارِ تشکّر

پرویز صاحب پچھلے دنوں ایک نجی تقریب کے سلسلہ میں کراچی تشریف لے گئے تھے۔ ان کے قیام کے دوران احباب نے جس محبت اور خلوص کا ثبوت دیا، اس کے لئے وہ انہیں انفرادی طور پر شکریہ کے خطوط نہیں لکھ سکے۔ وہ اِن سطور کے ذریعے ان کا شکریہ قبول فرمائیں

بابُ المراسلات

قصور کس کا ہے؟

ایک صاحب قلب حساس کا خط ملاحظہ فرمایئے!

"کچھ ہی سال اُدھر کی بات ہے جب میں ریلوے اسٹیشن پر بطور..... کام کرتا تھا۔ رات کے بارہ بجے ڈیوٹی سے فارغ ہوکر مسافر خانے میں جاکر ایک کپ چائے پی۔ جو گرم ہونے کے باوجود سرد ہونٹوں سے لگنے کے بعد ٹھنڈی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسی سردی میں مسافر خانے کے کونے میں ایک غریب خاندان جس پر غربت کو بھی شرم آئے، بیٹھا ہوا تھا۔ مرد جو مفلوک الحال ہونے کے علاوہ ٹی بی کے ملے خون تھوک رہا تھا۔ مجھے فارغ پاکر پتا جانے کیا سوچ کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا مجھے غالباً یہ بتانے کی ضرورت نہ آئے گی کہ مجھے ٹی بی ہے۔ ہاں اس بات کا آپ کو علم نہ ہوگا کہ میں حیدرآباد، مل میں اچھی خاصی کمائی کرتا تھا۔ جب ٹی بی ہوئی تو مل والوں نے نکال دیا۔ دوا دارو کیا۔ افاقہ تو خیر کیا ہونا تھا۔ مگر ہاں اثاثہ ضرور ختم ہوگیا۔ بھائی کے پاس رہنے لگا تو کچھ روز بعد بھاوج کے کہنے پر بھائی نے دھتکار دیا۔ آخر بیمار سے پیار بھی کون کرے۔ کوئٹہ جارہا تھا۔ بغیر ٹکٹ ہونے پر یہاں گاڑی سے اتار دیا گیا ہوں۔ کھانے کو تو خیر پہلے بھی کچھ نہ تھا۔ البتہ پینے کو آنسو تھے۔ ہائے رے وہ بھی نہ رہے۔ کیا آپ مجھے، میری بیوی اور بچیوں کو کوئٹہ پہنچانے کا انتظام کردیں گے۔ میں نے بچیوں کی طرف دیکھا۔ جن میں سے ایک کی عمر سات برس کے لگ بھگ اور دوسری کی تیرہ چودہ کے قریب تھی۔ دونوں بچیاں پھٹی ہوئی میلی سی ایک ہی چادر اوڑھے دونوں ایک دوسری کے ساتھ اکٹھی بیٹھی سردی کے مارے کانپ رہی تھیں۔ خاموش مگر کس حسرت سے ٹکٹکی باندھے مجھے چائے پیتے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس غریب خاندان کی کیا مدد کی۔ اسے چھوڑیئے۔ دو چار روز بعد

بھی جب اس خاندان کو وہیں پایا۔ تو میں نے چائے والے سے پوچھا کہ یہ لوگ ابھی تک کوئٹہ کیوں نہیں گئے تو ہنس کر کہنے لگا۔ کہ بھولے بادشاہو! ابھی سودا نہیں ہوا۔ مطلب؟ مطلب یہ کہ ایک زمیندار آیا تھا۔ وہ بڑی لڑکی کے آٹھ سو دے رہا تھا اور یہ بارہ سو مانگ رہے تھے۔ سودا نہیں ہوا۔ مگر وہ پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا ہے اور جب رات کے بارہ بجے ڈیوٹی سے فارغ ہو کر پھر چائے پینے گیا تو وہ خاندان وہاں نہیں تھا۔ دکاندار نے بھی کہا کہ معلوم نہیں وہ کب اور کہاں چلے گئے ہیں۔

مجھے معلوم نہیں کہ "سودا" ہوا یا نہیں۔ اگر نہیں ہوا تو بھی ایسے سودے آئے دن ہوتے ہی رہتے ہیں اور اگر سودا ہو گیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زمیندار اُس بچی کو اپنے ہاں لے جائے گا۔ اس کے ساتھ نوکروں سے بھی بُرا سلوک کیا جائے گا۔ کھانے کو اتنا دیا جائے گا کہ بمشکل زندہ رہ سکے۔ معصوم بچی کے سر پر کام ہو گا کہ صبح سے شام تک کرنے پر بھی ختم نہ ہو گا۔ اس پر ڈانٹ ڈپٹ اور گالی گلوچ مفت کی بچی کو ہر وقت زدوکوب کیا جائے گا مگر کیا مجال جو اُف بھی کر سکے۔ درد کا درماں نہ ہو گا۔ کوئی اُس کے سر پر دستِ شفقت پھیرنے والا نہ ہو گا۔ فرار ہونا تو درکنار تڑپ کر مر جانا بھی اک بات ہے مگر بچاری کو تو اس پر بھی اختیار نہ ہو گا۔ کچھ سالوں بعد اس کی ذمہ داریاں تبدیل ہو جائیں گی۔ پھر ایک جگہ سے دوسری تیسری اور چوتھی جگہ بکنا شروع ہو جائے گی اور خدا جانے کہاں کی کہاں پہنچ جائے گی۔

اس طرح اُس بچی نے تمام عمر گناہ اور دکھوں میں گزاری۔ آخر اس گناہ اور دُکھ کا ذمہ وار کون ہے؟ اگر گناہ کو معصوم بچی کے باپ کے سر تھوپ دیا جائے۔ یا معاشرے یا حکومت کو ذمہ وار ٹھہرایا جائے۔ بہرصورت بچی کو جو دکھ ملے آخر وہ کس سلسلے میں؟ کس جُرم میں؟ کس قصور کی پاداش میں؟ ذمہ وار کوئی ہو یا قصور کرنے والا کوئی ہو اور پکڑی جائے بچی۔ جیسے عیسائیوں کے ہاں ہے کہ "ہم اُن کا بدلہ اُن کی اولاد سے لیتے ہیں" یہ تو کسی طور مبنی برانصاف نہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ "ہر آدمی اپنے اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے"؛ یا "جو خرابی آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی ہوتی ہے"۔ تو بھی بچی نے اپنے کئے کا پھل نہیں پایا: بچی نے کون سا گناہ کر دیا تھا جس کی پاداش میں اُس کی تمام عمر دکھ میں بیتی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اُس بچی کو اگلے جہان جا کر دُکھ کے بجائے سکھ ملے گا۔ تو یہ بھی مبنی برانصاف نہیں۔ کہ قدرت نے اُسے اس جہان میں تو سکھ نہ دیا بلکہ اُلٹا سُکھ کے بجائے (اور لطف کی بات یہ کہ بغیر کسی گناہ کے) دکھ دیا۔

ان باتوں کو جوں جوں سوچتا ہوں پریشانی بڑھتی جاتی ہے۔ کیا آپ اس اضطراب کو دور کر سکیں گے؟"

طلوعِ اسلام ——— اسی قسم کے تھے وہ مقامات جہاں ذہنِ انسانی نے اپنے

بجز کا مظاہرہ مختلف انداز سے کیا۔ اس نے کبھی (عیسائیت کے عقیدہ کی رُو سے) یہ کہا کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولین ماں باپ کے گناہوں کا بوجھ لادے دنیا میں آتا اور اس کی پاداش میں دکھ جھیلتا ہے۔ کبھی (یونان سے برآمد شدہ اور ہندوؤں کے اپنائے ہوئے عقیدۂ تناسخ کی رُو سے) یہ کہا کہ ہر انسان اپنے پچھلے جنم کے کرموں کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا میں آتا ہے۔ کہیں اس نے (مجوسیوں کے تتبع میں اختیار کردہ، مسلمانوں کے عقیدہ کی رُو سے) یہ کہا کہ یہ باتیں انسان کی تقدیر سے متعلق ہیں جنہیں کوئی بدل نہیں سکتا۔ جن کا دل (بہانتا بدھ کی طرح) زیادہ رقیق تھا انہوں نے، اس قسم کے دو چار واقعات دیکھ کر، خود دنیا سے فرار کی راہ اختیار کر لی۔ اگر ان کے دل جذبات کی رو میں بہ جانے کی بجائے، حقائق کا بے نقاب سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا کر لیتے تو اس بات کا سمجھنا چنداں مشکل نہ ہوتا۔ اس طرح ان کے سامنے یہ حقیقت آجاتی، کہ فرد، معاشرہ کا جزو ہوتا ہے جس قسم کا معاشرہ، اس قسم کے افراد کے حالات ــــ غلط معاشرہ میں بے گناہ افراد بڑے دکھ جھیلتے اور تکلیفیں برداشت کرتے ہیں۔ اور اس معاشرہ کا مفاد پرست طبقہ انہیں "گناہِ اول"، "تناسخ" یا تقدیر کے عقیدوں میں الجھائے رکھتا ہے۔ تاکہ اُن کی نگاہ اِن کی طرف اٹھنے ہی نہ پائے۔ اگر انہیں بتایا، اور سمجھا دیا جائے کہ ان کی مصیبتیں اور تکلیفیں اسی معاشرہ کی پیدا کردہ ہیں تو وہ اٹھ کر اس معاشرہ کو زیر و زبر کر دیں اور اس کی جگہ صحیح معاشرہ قائم کر دیں۔ غلط معاشرہ کا یہی وہ "فتنہ" ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس سے محتاط رہو کیونکہ اس کی خرابیاں انہیں تک محدود نہیں رہا کرتیں جو ان کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ اس آگ کے شعلے دوسروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک اور بات بھی غور طلب ہے۔ ہماری نگاہ ان تکلیفوں کی طرف تو جاتی ہے جو غلط معاشرہ میں ہمیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ ان کے لئے ہم پکار اٹھتے ہیں کہ یہ سزا ہمیں کس جرم کی پاداش میں مل رہی ہے۔ لیکن معاشرہ کی طرف سے ہمیں جو سہولتیں میسر ہوتی ہیں، ان کے متعلق ہم کبھی نہیں سوچتے (اور کہتے) کہ ہم نے (انفرادی طور پر) وہ کون سے کارنمایاں کئے ہیں جن کے صلہ میں ہمیں یہ سب آسانیاں میسر ہو رہی ہیں۔ (مثلاً) انگریزی طب کی کتابوں میں ایک تصویر دیکھنے میں آئے گی۔ آج سے قریب دو اڑھائی ہزار سال قبل کا زمانہ ہے۔ یونان کا ملک ــــ ایک بادشاہ کی ٹانگ میں ناسور ہو گیا ہے جس کے متعلق اطبا کا آخری فیصلہ یہ ہے کہ ٹانگ کاٹ دی جائے۔ بادشاہ کو فرش پر لٹا رکھا ہے اور چار پانچ دیو ہیکل غلام اسے چاروں طرف سے دبائے ہوئے ہیں کہ وہ ہلنے نہ پائے۔ ایک "سرجن" آری سے اس کی ٹانگ کاٹ رہا ہے۔ ایک طرف کوئلے دھک رہے ہیں۔ جن میں لوہے کی سلاخیں گرم ہو رہی ہیں۔ پاس ہی کڑاہی میں تیل اونٹ رہا ہے۔ جب آری سے ٹانگ کٹتی ہے، تو دوسرا طبیب اسے لوہے سے داغتا ہے اور اس پر

گرم گرم تیل ڈالتا جاتا ہے تاکہ خون بند ہو جائے اور زخم جل کر سوکھ جائے۔ آپ سوچئے۔ کہ اس عملِ جراحی میں اس مریض بادشاہ پر کیا گزرتی ہوگی! اس نے چیخوں سے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے۔

اس سے اگلے ہی صفحہ پر دورِ حاضر کے ایک کلینک کی تصویر ہے جس میں سرجن نے مریض کو ایک ٹیکہ لگا کر بے حس کر دیا ہے اور نہایت اطمینان سے اس کا اپریشن کئے جا رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس بادشاہ نے کیا گناہ کیا تھا جس کی پاداش میں اسے اس قدر جانکاہ تکلیف برداشت کرنی پڑ رہی تھی۔ اور ہم نے کون سے "اعمالِ صالحہ" کئے ہیں جن کی جزا میں ہم اس قدر آرام اور راحت سے اپنا علاج کرا لیتے ہیں۔ یہ ہے معاشرہ میں افراد کی حالت کا نقشہ۔

یہ مثال طبیعی احوال و کیفیات کی ہے۔ اسی سے تمدنی اور عمرانی احوال و کیفیات کا اندازہ لگا لیجئے۔ جب اور جہاں معاشرہ، صحیح اقدارِ انسانیت کا حامل ہوگا، افراد کی زندگی سکون اور اطمینان سے گزرے گی۔ جب وہ غلط بنیادوں پر متشکل ہوگا، افراد مصیبتیں بھگتیں گے۔ قرآن کریم نے اس عظیم حقیقت کو بے نقاب کیا اور کہا کہ بے گناہ افراد کو مصیبتوں اور پریشانیوں سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ غلط معاشرہ کو صحیح معاشرہ میں تبدیل کیا جائے۔ معاشرہ کو غلط بنیادوں پر قائم رہنے دینا اور افراد کی مصیبتوں پر آنسو بہانا (یا خیرخیرات سے ان کی تکالیف کو دور کرنے یا ان میں کمی کرنے کی کوشش کرنا۔ حالانکہ اس سے ان کی طبیعی تکالیف تو دور ہو سکتی ہیں، لیکن ان کے شرفِ انسانیت کی جس قدر تذلیل ہوتی ہے، ایک قلبِ حساس کے نزدیک اس کی تکلیف، طبیعی تکلیف سے کہیں زیادہ اور شدید ہوتی ہے) یا تو کمزوریٔ اعصاب کی دلیل ہے اور یا مفاد پرست گروہ کی فریب کاری کا مظہر جس کا آلۂ کار مذہبی پیشوائیت بنتی اور مظلوموں کو غلط عقاید کی افیون پلا کر سلائے رکھتی ہے۔ ان مصیبتوں کا صحیح علاج غلط معاشرہ کی جگہ صحیح معاشرہ کی تشکیل کے سوا کچھ نہیں

صحیح معاشرہ کا قیام وہ عملِ صالحہ ہے جس کا خوش گوار اور حیات بخش ثمرہ تمام (موجودہ اور آنیوالی نسلوں تک کے) افرادِ معاشرہ کو ملتا ہے۔ اور غلط معاشرہ کو قائم کرنا، یا اس کے قائم رکھنے میں ممد و معاون بننا (خواہ یہ معاونت بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ) وہ جرم ہے جس کی پاداش میں افرادِ معاشرہ اس قسم کی تکلیفیں برداشت کرتے اور دکھ جھیلتے ہیں ـــــ غلط معاشرہ کو بدلنے والے افراد بھی اپنی ان کوششوں میں تکلیفیں اٹھاتے ہیں۔ لیکن اس سے ان کی ذات کی ایسی نشوونما ہو جاتی ہے کہ اس کے مقابلہ میں طبیعی تکالیف اور مصائب ہیچ ہو جاتے ہیں۔

نظامِ ربوبیّت قائم کیسے ہو؟

ایک خط کا اقتباس۔

"یونیورسٹی کیمپس میں آپ کی تقریر" (جو طلوع اسلام میں "کمیونزم اور اسلام" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے) اس میں ایک اہم سوال کا جواب نہیں دیا گیا۔ وہ سوال یہ ہے کہ جو معاشی نظام رسول اللہ اور صحابہؓ کے زمانے میں قائم ہوا تھا اسے اب دوبارہ کس طرح قائم کیا جائے"؟

اس سوال کے جواب سے پہلے، ایک پس منظر کا سامنے لانا ضروری ہے۔ جب نبی اکرمؐ نے اس نظام کی دعوت دی ہے تو دنیا میں (حضورؐ کے سوا) کوئی مسلمان نہیں تھا ـــــ حضورؐ کو قرآن نے اول المسلمین کہا ہے ـــــ آپؐ نے یہ دعوت علیٰ وجہ البصیرت پیش کی۔ لوگوں نے اس پر غور و فکر کیا۔ جو اس سے متفق ہوا، وہ اس دعوت کو قبول کر کے، اس انقلابی جماعت کا ممبر بن گیا۔ اس کے لئے اسے ایک معاہدہ کرنا ہوتا ہے کہ "میں نے اپنا مال اور جان بیچ دیا ہے"۔ یہ تھی وہ جماعت (سوسائٹی) جس کے اراکین، اس نظام کے عمل بردار تھے۔ نبی اکرمؐ ان کی صحیح تعلیم و تربیت فرماتے تھے ـــــ یہ حضورؐ کا فریضہ تھا ـــــ لہٰذا ان کے لئے اس نظام کی اقامت، ان کی زندگی کا مقصد تھا۔

لیکن اس وقت صورت مختلف ہے۔ اس وقت پہلے سے ایک جماعت موجود ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہے۔ ـــــ اپنے آپ کو مسلمان تو کہتی ہے۔ لیکن اس نے اس معاہدہ پر دستخط نہیں کئے جس کی رو سے ایک شخص اس جماعت کا ممبر بنتا تھا۔ دستخط کرنا تو ایک طرف، ان کے ذہن میں اس معاہدہ کا تصور تک نہیں۔

لیکن ہے انہیں غیر مسلم بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے کہ ان کا دعوٰے تو بہرحال یہی ہے کہ ہم خدا کے احکام کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں ـــ ان کی موجودہ حالت کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سامنے خدا کے احکام ان کی اصلی شکل میں پیش ہی نہیں کئے گئے۔ یہ اسی اسلام کو سچا دین سمجھ رہے ہیں جو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے۔

لہٰذا، کرنے کا کام یہ ہے کہ موجودہ مسلمانوں کو بتایا جائے کہ قرآن کریم کی رُو سے مسلمانوں کے لئے صحیح نظام زندگی کیا ہے۔ اور اس کے بعد اس نظام کو قانوناً نافذ کر دیا جائے۔

واضح رہے کہ موجودہ مسلمانوں پر اس نظام کو قانوناً نافذ کرنا ان پر زبردستی کرنے کے مرادف نہیں ہوگا اس لئے کہ ان کے مسلمان ہونے کے دعوٰے میں یہ بات مضمر (IMPLIED) ہے کہ یہ قانونِ خداوندی

کی اطاعت بہ طیب خاطر کریں گے۔ اس لئے انہیں صحیح قرآنی نظام کا پابند بنانا اس مضمر (IMPLICIT) کو صفت مشہود (EXPLICIT) کرنا ہے۔ ان پر کچھ زبردستی ٹھونسنا نہیں۔

لیکن یہ عبوری دور کا پروگرام ہوگا۔ اس لئے کہ یہ نظام اپنے حقیقی رنگ میں اسی صورت میں متشکل ہو سکتا ہے۔ جب اس کی صداقت، انسان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کو صحیح اسلامی نظام کی تعلیم اس انداز سے دیں کہ اس کی صداقتیں ان کے دل کی آواز بن جائیں۔ اس طرح یہ آنے والی نسل اس انداز کی مسلمان ہوگی جس انداز کے مسلمان رسول اللہ کی دعوت پر لبیک کہنے والے تھے۔ یہ جماعت مومنین اس نظام کو آگے لیکر چلنے کے قابل ہوگی۔

یہ ہے کرنے کا کام — لیکن اس کے لئے بڑی ہی مومنانہ نگاہ اور جرأت مندانہ قلب کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے کہ یہ انقلاب، خود اپنے ہاں کی، اور اس کے بعد ساری دنیا کی ملوکیت، سرمایہ داری، اور مذہبی پیشوائیت کی قوتوں کے خلاف اعلان جنگ ہوگا۔ اور ایسی جنگ وہی مول لے سکتا ہے جو (اقبال کے الفاظ میں) "قلندرانہ اداؤں اور سکندرانہ جلال" کا مالک ہو — یعنی ایک مرد مومن — اور یہی وہ جنس گراں مایہ ہے جو آج نایاب ہے — لیکن اس کے باوجود ہم ناامید نہیں۔ اس دنیا میں انسانی عمرانیت کا منتہیٰ وہی ہے جسے قرآن کریم نے جنتی معاشرہ سے تعبیر کیا ہے۔ اس معاشرہ کو قائم ہونا ہے اور قائم ہو کر رہے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ سعادت کس کے حصے میں آتی ہے۔ ٥

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکیں دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر

زرِ مہر

یہ واقعہ ہے ایک مجلس نکاح کا۔ مہر کی بات چلی تو لڑکی والوں نے ایک خطیر رقم بطور حق مہر تجویز کی۔ سننے والوں نے اسے اس طرح سنا جیسے اس سوال کو کوئی اہمیت ہی حاصل نہیں۔ اور "ہاں! ٹھیک ہے" کہہ کر آگے بڑھنے لگے۔ دولہا سہرا باندھے خاموش بیٹھا تھا — نکاح کی تقریب پر دولہا کا خاموشی سے بیٹھے رہنا، آداب عروسی کا تقاضا سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس نے بات آگے نہ چلنے دی اور آہستہ سے کہا کہ مجھ میں اتنی رقم ادا کرنے کی استطاعت نہیں۔ یہ اتنی رکھئے جتنی میں ادا کر سکوں۔

اس پر لڑکی والوں کی طرف سے بیک وقت دو تین آوازیں اٹھیں کہ مہر ادا کرنے کے لئے تھوڑا ہوتا

ہے۔ اسے تو بس لکھا جاتا ہے۔ کون دیتا ہے اور کون لیتا ہے۔ اس سے لڑکی کی عزت مقصود ہوتی ہے

اس پر دولہا نے ذرا بلند آواز سے کہا کہ میں بھی یہی سمجھا کرتا تھا کہ یہ رقم یونہی "رسماً" لکھ دی جاتی ہے۔ دینا دوانا کسی کو نہیں ہوتا۔ لیکن اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ بات غلط ہے۔ مہر ادا کرنا ہوتا ہے۔ اگر یہ رقم میرے پاس نقد موجود ہوتی تو میں اسی وقت ادا کر دیتا۔ لیکن چونکہ میں اسے نقد ادا نہیں کر سکتا، اسلئے یہ میرے ذمہ قرض واجب الادا ہے۔ اس قرض کو مجھے اپنی اولین فرصت میں ادا کرنا ہوگا۔

اس پر پانچ سات آوازیں ادھر ادھر سے بلند ہو گئیں کہ واہ! یہ نئی بات ہے۔ ہم سب کے مہر کتنے ہی باندھے گئے تھے۔ کسی نے ایک پائی بھی ادا نہیں کی۔

اب دولہا سے نہ رہا گیا۔ اس نے چہرے سے سہرا الٹا۔ اور بلند آواز سے کہا کہ میرے بزرگو! نکاح ایک معاہدہ ہے جس کی رُو سے، ایک مرد اور ایک عورت، باہمی رفاقت کی ازدواجی زندگی بسر کرنے کے لئے بہت سے حقوق اور ذمہ داریوں کا اقرار کرتے ہیں۔ مہر اسی معاہدہ کی ایک شق ہوتی ہے۔ آپ حضرات ہماری اس نئی زندگی کے پہلے ہی دن مجھے یہ تعلیم دے رہے ہیں کہ یہ معاہدہ یونہی رسمی ہوتا ہے۔ اسے پورا نہیں کیا کرتے۔ میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ جس معاہدہ کے وقت پہلے ہی سے یہ نیت کر لی جائے کہ اسے پورا نہیں کرنا، کیا اسے معاہدہ کہیں گے یا فریب دہی؟ اور جس رشتے کا آغاز ہی فریب دہی سے ہو اس کے انجام کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے۔

ان الفاظ پر بجائے اس کے کہ ان "بزرگوں" کی نگاہیں ندامت سے جھک جائیں۔ وہ الٹے بپھر کر بولے — تم ہمیں فریب کار سمجھتے ہو۔ دیکھو اس زمانہ کے نوجوانوں کی حالت، اپنے بزرگوں کو فریبی کہتے ہیں۔ اگر یہ فریب ہے تو ہم ہی فریبی نہیں، ہمارے بزرگ بھی سب فریبی تھے۔ اس لئے کہ یہ رسم آج کی نہیں صدیوں سے ایسے ہی چلی آتی ہے۔

اور حیرت ہے کہ اس بھری محفل میں ایک فرد بھی ایسا نہ نکلا جو اٹھ کر اس سعادت بخت نوجوان کی پیشانی چوم لیتا اور کہتا کہ شاباش بیٹا! قوم کو تمہارے جیسے نوجوانوں پر ناز ہے جو معاہدہ کی پابندی کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود دولہا قطعاً نہ گھبرایا۔ وہ اپنی بات پر جما رہا اور بار بار دہراتا رہا کہ آپ کچھ بھی سمجھئے اور کچھ بھی کہئے، مجھے تو اس رقم کو ادا کرنا ہے۔ اور میں جو وعدہ کروں گا، اسے پورا کروں گا۔

اس کی اس جرأت حق گوئی اور اصول پرستی کا نتیجہ تھا کہ مہر اتنا ہی باندھا گیا جتنے کے ادا کرنے کی اس میں استطاعت تھی۔

طلوعِ اسلام

ہم اس فیروز بخت نوجوان کو دلی مبارک باد دیتے ہیں جس نے اپنی ہمت اور بیباکی سے ایک ایسی غلط رسم کو توڑا جس نے واقعی ہماری قوم کو (غیر شعوری طور پر ہی سہی) فریب کار بنا رکھا ہے اور ہم مبارکباد دیتے ہیں اس کی خوش بخت بیوی کو جسے اس قسم کا رفیقِ حیات ملا جسے اپنے معاہدات کی پابندی کا اس قدر احساس ہے اور مستحقِ مبارک باد سمجھتے ہیں اس خاندان کو جس نے اس قسم کے صالح نوجوان سے عزیزداری کے جدید تعلقات وابستہ کئے ہیں۔ ہماری دلی آرزو ہے کہ خدا اس نوجوان کو اس قسم کی جرأت اور اصول پرستی کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائے اور اس کا یہ اقدام دوسرے نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو۔ ازدواجی زندگی سے متعلق احکام کے سلسلہ میں خدا نے کہا تھا کہ — وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا (۲/۲۳۱)۔ دیکھنا! احکامِ خداوندی کو مذاق نہ بنا لینا — ہم نے انہیں واقعی مذاق بنا رکھا ہے اور اس پر شرمانے کی بجائے فخر کرتے ہیں ؛

بزمیں متوجّہ ہوں!

طلوعِ اسلام کنونشن کے فیصلہ کیمطابق، ملک میں پھیلی ہوئی بزموں نے "مجلہ طلوعِ اسلام کی اشاعت بڑھانے کے سلسلہ میں جس گرمجوشی کا ثبوت دیا ہے ادارہ اس کے لئے ان کا شکر گزار ہے دوسری طرف اس اسکیم کے ماتحت شائع شدہ پہلے شمارہ کی ہزارہا کاپیوں کو پبلک نے جس ذوق و شوق سے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے وہ اس حقیقت کی دلیل ہے کہ طلوعِ اسلام کی پیش کردہ قرآنی فکر ملک میں کس قدر مقبول ہو رہی ہے۔ ملک کا سنجیدہ طبقہ قرآن کریم کی طرف آنے کے لئے بیتاب ہے۔ یہ ہماری کم کوشی ہے کہ ہم ان تک اس پیغام کو پہنچا نہیں سکے۔ ہمیں امید ہے کہ اس جدید اسکیم کے مطابق یہ پیغام ملک کے گوشے گوشے تک پہنچ جائے گا۔ آپ ذرا ہمت سے کام لیجئے اور اپنی رفتار کو سست نہ ہونے دیجیے پھر دیکھیے کہ اسکے نتائج کس قدر خوشگوار ثابت ہوتے ہیں۔ "علیک البلاغ وعلینا الحساب" کا قرآنی اصول پیشِ نظر رکھیے۔ آپکا کام اسے دوسروں تک پہنچاتے چلے جانا ہے آپ اسے پہنچاتے چلے جائیے نتائج خدا کے قانون کیمطابق خود بخود مرتب ہوتے چلے جائینگے۔ والسلام — ادارہ طلوعِ اسلام

نقد و نظر

مجموعۂ قوانینِ اسلام

بڑے سائز، عمدہ دبیز کاغذ، صاف ٹائپ۔ قریب ۴۰۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب تنزیل الرحمٰن صاحب کی مرتب کردہ، اور مرکزی ادارۂ تحقیقات اسلامیہ (کراچی) کی طرف سے شائع کردہ ہے۔ مجلد کی قیمت دس روپے ہے۔

اس کتاب کا نام غلط فہمی پیدا کرنے کا موجب ہے۔ یہ "قوانین اسلام کا مجموعہ نہیں بلکہ مسلمانوں کے مروجہ فقہی قوانین کا مجموعہ ہے اور وہ بھی صرف نکاح، مہر، اور نفقہ سے متعلق۔ مؤلف نے ان قوانین کی ضابطہ بندی (CODIFICATION) میں محنت سے کام لیا ہے اور ترتیب سلیقہ سے دی ہے۔ جو لوگ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ مذکورہ بالا ہر سہ موضوعات سے متعلق مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے ہاں مروجہ قوانین شریعت کیا ہیں اور مملکتِ پاکستان کے مروجہ قوانین کیا، ان کے لئے یہ تالیف مفید رہے گی۔ البتہ جہاں مؤلف نے اپنی آراء درج کی ہیں وہ محل نظر ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ اگر وہ اس سے احتراز برتتے تو زیادہ بہتر تھا مثلاً مروجہ فقہی قانون کی رو سے نابالغ کا نکاح جائز ہے اور قرآن کریم نکاح کے لئے بلوغت کو شرط قرار دیتا ہے۔ اس کتاب میں قرآن کریم کے اس حکم کو بھی درج کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی نابالغ کے نکاح کی تائید میں مختلف دلائل بھی دیئے گئے ہیں (جن میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ کا نکاح چھ برس کی عمر میں ہوا تھا۔ حالانکہ یہ بات ہی سرے سے غلط ہے۔ نکاح کے وقت حضرت عائشہ کی عمر ۱۷ اور ۱۹ برس کے درمیان تھی۔) پاکستان کے مروجہ قانون کی رو سے، نابالغ کا نکاح ممنوع قرار دے دیا گیا۔ یہ قانون قرآن کریم کے عین مطابق ہے اور اس خلافِ قرآن روش کا سدِ باب کرتا ہے، جو ہمارے ہاں بدقسمتی سے ہزار برس سے متوارث چلی آ رہی ہے۔ اس سلسلہ میں مؤلف

لکھتا ہے:۔

یہ امر کہ صغرسنی کی شادیوں کو پاکستان میں ممنوع قرار دے دیا گیا، ایک سماجی مسئلہ ہے، اور اس مسئلہ کو خالص مذہبی انداز میں سوچنے کے بجائے سماجی اور معاشرتی پہلو سے بھی سوچنا اور غور کرنا چاہیئے۔

ہم حیران ہیں کہ جس مسئلہ کے متعلق قرآن کریم کا ایسا واضح فیصلہ موجود ہو اسے "سماجی مسئلہ" قرار دینا ستم ظریفی کے سوا اور کیا ہے؟ یہیں تک بس نہیں، مؤلف نے اپنی تجویز میں لکھا ہے۔

پاکستان میں نافذالوقت قانون کے تحت نابالغوں کی شادی کرنا ممنوع اور قابل سزا جرم ہے۔ نابالغوں کی شادیوں کا مطلقاً ممنوع قرار دینا مصالح شرعیہ کے خلاف ہے اس ضمن میں ضروری ہے کہ نافذالوقت قانون میں مناسب ترمیم کی جائے اور نابالغوں کی شادیوں کی اجازت دی جائے۔

کتاب کے جیکٹ پر، کتاب کا مقصد ان الفاظ میں دیا گیا ہے۔

اس کتاب کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ملک میں اسلامی قانون کی ضابطہ بندی کی تحریک کو علمی بنیادوں پر منظم کر کے حکومت کے لئے اہم اسلامی قوانین کا ایک خاکہ فراہم کر دیا جائے جو اسلامی قانون سازی میں مدد و معاون ثابت ہو۔

ہم دریافت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ اس قسم کی آراء اور تجاویز (جن میں سے صرف ایک نمونۃً اوپر درج کی گئی ہے اور اس جیسی اور بھی کئی ایک اس کتاب میں موجود ہیں) "اسلامی" قانون سازی کے سلسلہ میں حکومت کے لئے مدد و معاون ثابت ہوں گی یا اسے خلاف قرآن راستے پر چلانے کے لئے محرک و مؤید؟ ادارۂ تحقیقات اسلامی خود حکومت کا ادارہ ہے جس کا وجود آئین پاکستان کی رُو سے عمل میں آیا ہے۔ ہم اس ادارہ کی خدمت میں عرض کریں گے کہ اگر اس میں اتنی جرأت نہیں کہ ہمارے مروجہ قوانین شریعت یا قوانین پاکستان میں جو قانون قرآن کریم کے خلاف ہے اس کی کھلے بندوں مخالفت کرے۔ تو کم از کم اتنا ہی کرے کہ مروجہ قوانین کی ضابطہ بندی کے سلسلہ میں اپنی طرف سے کوئی رائے یا تجویز پیش نہ کرے اور مروجہ قوانین کی میکانکی طور پر ضابطہ بندی کر دے۔ اس سے ضروری معلومات حاصل ہو جائیں گی لیکن غلط فہمیاں پیدا نہیں ہوں گی۔ ہمیں امید ہے کہ اس سلسلہ کی اگلی کڑیاں شائع کرنے وقت ادارہ اس کا خاص طور پر خیال رکھے گا۔

۲۔ تبصرۂ محمودی بر ہفوات مودودی

۳۔ اصحابِ رسول کا عادلانہ دفاع،

مودودی صاحب نے حضرت عثمانؓ اور دیگر صحابہ کبارؓ کے خلاف طعن و تشنیع کی جو مہم جاری کی تھی اس نے ملک کے مختلف گوشوں میں کافی تحرک پیدا کر دیا ہے اور اس کی تردید میں آجکل بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ چنانچہ زیر نظر ہر دو مطبوعات کا یہی موضوع ہے۔ تبصرۂ محمودی، محترم محمود احمد عباسی کی تحقیقاتی مساعی کا ماحصل ہے۔ عباسی صاحب سے قارئین طلوع اسلام اچھی طرح متعارف ہیں۔ ہمارے قرن اول کی تاریخ کے نازک گوشوں پر ان کی نگاہ بڑی وسیع اور گہری واقع ہوئی ہے اور وہ جو بات لکھتے ہیں تجسس و تفحص کے بعد لکھتے ہیں۔ ان کی یہی خصوصیت زیر نظر کتاب میں بھی موجود ہے۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مودودی صاحب نے اپنے مضامین میں اقتباسات اور حوالوں میں کس قدر دیدہ دلیری سے کام لیا ہے کتاب قریب اڑھائی سو صفحات پر مشتمل ہے اور تین روپے ۲۵ پیسے میں (لاہور میں) مکتبہ علم و حکمت موتر منڈی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ کراچی میں ناشر کا پتہ ـــــ مکتبہ محمود - ۲/۲۹ بی ایریا۔ لیاقت آباد۔ کراچی ۱۹ ہے ـــــ ہے

دوسری کتاب سید نور الحسن بخاری کی تالیف ہے جس پر قاضی احسان احمد صاحب (شجاع آبادی) نے مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ کتاب سلیقہ اور محنت سے لکھی گئی ہے اور کتب تاریخ سے مودودی صاحب کے اعتراضات میں سے ایک ایک کا جواب دیا گیا ہے۔ کتاب قریب پونے تین سو صفحات پر مشتمل ہے ـــــ

قیمت درجہ اول تین روپے، درجہ دوم اڑھائی روپے۔ ملنے کا پتہ:- دار التصنیف والاشاعت (محلہ قدیر آباد۔ ملتان شہر) (۴۰۔ بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور)

صحابہ کبارؓ کی عظمت کو اجاگر کرنے کے لئے محترم عباسی صاحب اور بخاری صاحب کی یہ کوششیں در خورِ تحسین و ستائش ہیں۔ لیکن اگر ان کا خیال یہ ہے کہ اس سے مودودی صاحب یا ان کی جماعت کے افراد اپنی غلطی کا اعتراف کر لیں گے تو یہ خیال خام ہے۔ مودودی صاحب کی کیفیت یہ ہے کہ جب ان کے خلاف یہ الزام عاید کیا گیا کہ وہ عملی زندگی میں ان اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں جنہیں وہ جماعت سازی کے زمانے میں اس شد و مد سے پیش کیا کرتے تھے۔ تو انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ کچھ تو (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ۔ نقل کفر، کفر نہ باشد) خود رسول اللہ بھی کیا کرتے تھے۔ میں نے ایسا کر دیا تو کون سی قیامت آگئی اور ان کی جماعت میں سے کسی ایک نے بھی ان کی اس جسارت کے خلاف ایک لفظ تک نہ کہا۔ ان لوگوں

سے یہ توقع رکھنا کہ وہ صحابہ کبارؓ کی عظمت کے پیش نظر اپنی اس قسم کی حرکات سے باز آجائیں گے، خیال خام ہے۔ کیا معلوم کہ اس کے پیچھے ان کے کون سے سیاسی مقاصد پوشیدہ ہیں۔ انہیں نہ دین سے کوئی واسطہ ہے نہ اسلام سے۔ نہ رسولؐ سے کوئی تعلق ہے، نہ صحابہؓ سے۔ انہیں واسطہ ہے فقط اپنے سیاسی مقاصد سے اور وہ خدا۔ رسول۔ صحابہ۔ اسلاف۔ کو ذریعہ بناتے ہیں اپنے مقاصد کے حصول کا اور بس۔

---

(۴) تاویل الاحادیث (عربی)

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی یہ تصنیف، پروفیسر غلام مصطفےٰ صاحب قاسمی کی ترتیب کے بعد شاہ ولی اللہ اکادمی ــــ صدر حیدر آباد (پاکستان) کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ ابتدا میں مرتب کا مبسوط مقدمہ ہے۔ کتاب عمدہ کاغذ پر ٹائپ میں چھپی ہے اور قیمت فی جلد تین روپے ہے۔ شاہ صاحبؒ کی یہ تصنیف قصص الانبیاء۔ کے سلسلہ میں ہے اور یہ اچھا ہے کہ ہمارے اسلاف کی تصنیفات اس طرح سے محفوظ ہو جائیں۔ لیکن ہمارے دور میں (جب عربی تو ایک طرف لوگ فارسی سے بیگانہ اور اردو تک سے غیر مانوس ہوتے چلے جا رہے ہیں) اس قسم کی کتابیں اس صورت میں مفید ہو سکتی ہیں۔ جب انہیں باترجمہ شائع کیا جائے۔ اس کتاب میں شاہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں حضرات انبیاء کرامؑ کی زندگی کے بعض اہم واقعات کی، اپنے فلسفہ اور تصوف کے رنگ میں تشریح کی ہے۔ مقدمہ میں، ان مقامات سے متعلق مولانا عبید اللہ سندھی (مرحوم) کی توضیحات بھی دی گئی ہیں۔

پرویز صاحب کا درس قرآن کریم

لاہور ــــ (۲۵۔ بی)، گلبرگ ۲ ــــ ہر اتوار کی صبح ۹ بجے
کراچی ــــ سندھ اسمبلی ہال، بندر روڈ ــــ ہر اتوار کی صبح ۹ بجے
لائلپور ــــ پنجاب ڈیری پریز (۸۰۔ ہم) پیپلز کالونی ــــ ہر جمعہ کی شب بعد نماز عشاء
لیہ ــــ نقل ہوٹل (نزد ریلوے اسٹیشن) ــــ ہر جمعہ کو، بعد نماز جمعہ
ملتان ــــ میسرز شاہ محمد اینڈ سنز، بیرون پاک دروازہ ــــ ہر جمعہ کو، بعد نماز جمعہ
علاوہ ازیں، یہ درس، راولپنڈی، سرگودھا، سیدن میں بھی جاری ہے۔
مقام اور وقت کے متعلق مقامی بزم کے نمائندہ سے دریافت فرمائیں
انگلستان میں یہ درس بزم طلوع اسلام، بریڈ فورڈ کے زیر اہتمام نشر ہوتا ہے۔

بہ سلسلہ طلوعِ اسلام کنونشن
۱۹۶۶ء

طلوعِ اسلام کالج

۲۰ مارچ - اتوار کی صبح — پرویز صاحب نے اپنے خطاب بہ عنوان "میرا پیغام" میں مجوزہ طلوعِ اسلام کالج کا بھی ذکر کیا۔ خطاب کے بعد قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے سیکرٹری، محترم شیخ سراج الحق صاحب نے اس سوسائٹی کے اغراض و مقاصد کا تعارف حسبِ ذیل الفاظ میں کرایا۔ طلوعِ اسلام

صدر محترم و معزز سامعین!

پرویز صاحب نے ابھی ابھی بتایا ہے کہ ان کی زندگی کا اب آخری پروگرام یہ ہے کہ وہ قوم کی نئی نسل کے عمدہ صلاحیت رکھنے والے بچوں اور بچیوں کو لے کر بیٹھ جائیں اور ان کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کریں کہ وہ قلب اور دماغ دونوں کے اعتبار سے ایک صحیح انسان کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اسی کو قرآن مجید کی اصطلاح میں مومن کی زندگی کہتے ہیں جس کا فریضۂ حیات ابنِ آدم کو حیوانی سطحِ زندگی سے اٹھا کر انسانی سطح پر لے جانا ہے۔ پرویز صاحب کا یہ مقصد اتنا بلند اور اس کے نتائج اس قدر درخشندہ ہو سکتے ہیں جن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کا وجود عمل میں لایا گیا۔ سوسائٹی کے پیشِ نظر پروگرام یہ ہے کہ اس تعلیم کا انتظام کالج کی ابتدائی اسٹیج سے کیا جائے اور پھر اسے بتدریج اوپر کو یونیورسٹی کی سطح تک لایا جائے اور نیچے ابتدائی مدرسوں تک۔ اس پروجیکٹ کی تکمیل تو ظاہر ہے بتدریج ہوگی۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کے لئے اراضی اتنی حاصل کر لی جائے جو اس پروگرام کے لئے آخر تک کافی ہو۔ ہم نے اس سلسلہ میں قوم سے عطیات کی اپیل کی تھی۔ لیکن ابھی سلسلہ شروع ہی ہوا تھا کہ جنگ کی وجہ سے ہنگامی حالات پیدا ہو گئے۔ یہ ضرورت وہ تھی جسے ہر انفرادی اور اجتماعی ضرورت پر ترجیح دینا چاہیئے تھی۔

اس لئے ہم نے احباب سے کہہ دیا کہ کالج کے عطیات کا سلسلہ ملتوی کر دیں اور جو کچھ کسی سے بن پڑے وہ جنگ کی ضروریات کے لئے وقف کر دے۔

بللہ الحمد کہ ہنگامی حالات ختم ہو گئے ہیں اور اب پھر معاشرہ کی زندگی اعتدال پر آگئی ہے اس لئے کالج کے لئے فنڈ اکٹھا کرنے کی مہم پھر شروع کی جارہی ہے۔

مجوزہ کالج کے سلسلہ میں تجویز یہ ہے کہ جب تک اس کی اپنی یونیورسٹی نہ بنے اسے پنجاب یونیورسٹی سے ملحق رکھا جائے۔ لیکن طلبار کو نصاب کی تعلیم اس انداز سے دی جائے کہ اُن کی اپنی صلاحیتیں بیدار ہوں۔ اُن میں کھوٹے اور کھرے میں تمیز کرنے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ انہیں اس کا احساس ہو جائے کہ علم کا مقصد کیا ہے اور پاکستان اور اسلام ہمارے ساتھ کیا تو قعات وابستہ رکھتا ہے۔ اس طرح یہ طالب علم نصاب کی تعلیم کے اعتبار سے دوسرے کالجوں کے طلبار کے مقابلہ میں کسی صورت میں پیچھے نہیں رہیں گے اور جہاں تک ان کے قلب و دماغ کا تعلق ہے وہ صحیح اسلامی قالب میں ڈھل جائیں گے۔ اُن کی زندگی کے اقدار بدل جائینگے اُن کا نقطۂ نگاہ بدل جائے گا۔ اُن کے نفع و نقصان کے پیمانے بدل جائیں گے اور اس طرح وہ قوم کے ایسے جوہر قابل بن جائینگے جنہیں دیکھنے کے لئے آج ہماری آنکھیں ترستی ہیں۔ تجویز یہ ہے کہ مجوزہ کلاسز لڑکوں کے لئے بھی کھولی جائیں اور لڑکیوں کے لئے بھی کہ انسانیت کی گاڑی کے دونوں پہیے متوازن رہنے چاہئیں۔

مجوزہ کالج کے پروگرام کے متعلق ایک مختصر سا اعلامیہ شائع کیا گیا ہے جس کی کاپیاں ان لفافوں میں بند ہیں جو میرے احباب آپکو بعد دوپہر کی نشست میں تقسیم کرینگے۔ آپ اِس اعلامیہ کا بغور مطالعہ فرمائیں اور اس کے بعد ہمیں اپنے مشوروں سے بھی مستفید فرمائیں۔ اگر آپ ہماری اس تجویز سے متفق ہوں تو آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس سلسلہ میں خود بھی مالی امداد کیجئے اور اپنے حلقۂ اثر سے بھی فنڈ اکٹھا کیجئے۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کو حکومت کے ہاں سے باقاعدہ رجسٹر کرا لیا گیا ہے اور جو عطیات اس سلسلے میں دیئے جائینگے حکومت پاکستان نے انہیں اپنی چٹھی 65/ 32/ (69) 7/ مورخہ ۲ اگست ۱۹۶۵ء کی رو سے انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیدیا ہے اگر اس سلسلہ میں مزید استفسارات کی ضرورت ہو تو اس پتہ پر خط و کتابت کی جا سکتی ہے۔

سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی ۲۵/بی گلبرگ لاہور

یہ پتہ اعلامیہ کے اندر بھی درج ہے میں اتنا اور عرض کر دوں کہ اس تعلیمی پروگرام کے سلسلہ میں آپکا تعاون نہ صرف موجودہ بلکہ ہماری آنیوالی نسلوں تک کیلئے وجہ احسان مندی ہوگا اور اس کیلئے ملت پاکستانیہ آپکی شکر گزار ہوگی اور یہ ایک بہت بڑی دینی خدمت بھی ہوگی کہ اس ٹکسال سے صحیح مسلمان ڈھل کر نکلیں گے۔

(والسلام)

ادارہ طلوع اسلام کی بصیرت افروز مطبوعات

(۱) **انسان نے کیا سوچا؟** افلاطون اعظم سے لیکر اب تک گزشتہ ساڑھے تین ہزار سالوں میں فکرِ انسانی کن مراحل میں سے گزری ہوئی، کہاں سے کہاں تک پہنچی۔ مفکرینِ عالم کی ہزاروں کتابوں کا لبِ لباب ——— قیمت۔ بارہ روپے

(۲) **اسلام کیا ہے؟** اسلام کے درخشندہ حقائق کا حقیقت کشا مرقع۔ مفکرِ قرآن کی بصیرتِ قرآنی کا بصیرت آفریں شاہکار ——— قیمت - اعلیٰ ایڈیشن۔ آٹھ روپے ——— سستا ایڈیشن۔ چار روپے

(۳) **من و یزداں** خدا کیا ہے؟ اسے ماننا کیوں ضروری ہے؟ نہ ماننے سے کیا ہوتا اور ماننے سے کیا کچھ حاصل ہوتا ہے؟ ذہنِ انسانی میں ابھرتے ہوئے ان بنیادی سوالات کا جواب قرآن کریم کی روشنی میں ——— قیمت۔ دس روپے

(۴) **ابلیس و آدم** آدم۔ ملائکہ۔ وحی۔ ابلیس۔ شیطان۔ جن ——— ان سب کی حقیقت قرآن کریم کی رو سے کیا ہے؟ یہ حقائق اسی کتاب کے مطالعہ سے سامنے آسکتے ہیں ——— قیمت۔ آٹھ روپے

(۵) **سلیم کے نام خطوط** (تین جلدیں ہیں)، ہماری نئی نسل کے ذہنوں کو کس قسم کے سوالات طلسم پیچ و تاب بنائے ہوئے ہیں اور فکرِ قرآنی کس حسین انداز سے انہیں روشنی میں لاکر شادابیٔ قلب و نگاہ کا سامان پیدا کرتی ہے ——— اسے علیٰ وجہ البصیرت سمجھنے کے لئے ان کا مطالعہ اشد ضروری ہے۔ ——— قیمت۔ جلد اول۔ آٹھ روپے۔ جلد دوم سوم چھ چھ روپے

(۶) **سلسبیل** پرویز صاحب کے علم افروز مقالات اور حقیقت کشا خطابات و نشریات کا مجموعہ ——— قیمت۔ آٹھ روپے

(۷) **بہارِ نو** انہیں مقالات اور خطابات کا دوسرا مجموعہ ——— سستا ایڈیشن ——— قیمت۔ پانچ روپے

(۸) **اسبابِ زوالِ امت** عروج و اقبال کے مقاماتِ بلند سے محروم ہو کر ہم زوال اور شکست کی موجودہ پستی تک کیوں پہنچے۔ اس اہم اور تاریخی سوال کا جواب قرآنِ کریم کی بارگاہِ عالی سے ——— قیمت۔ ڈیڑھ روپیہ

(۹) **اسلامی معاشرت** روزمرہ کی زندگی کے اہم مسائل کی تفصیل قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ——— قیمت دو روپے

اسی سلسلہ بصیرت افروز کی مزید کڑیاں۔ مقامِ حدیث۔ چار روپے ——— برقِ طور۔ چھ روپے ——— شعلۂ مستور چھ روپے

لغات القرآن۔ جلد اول۔ دوم۔ سوم۔ پندرہ پندرہ روپے ——— جلد چہارم بارہ روپے۔ مکمل سیٹ پچاس روپے ۵۷/-

فجر الاسلام۔ آٹھ روپے ——— الفتنۃ الکبریٰ۔ چھ روپے

شائع کردہ

ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

طلوعِ اسلام
کنونشن

بزمِ مذاکرہ ——— منعقدہ ۱۹ مارچ ۱۹۶۶ء

موضوع!

میں کیوں زندہ رہنا چاہتا (چاہتی) ہوں

صدر ——— محترمہ مسز رضا علی (کراچی)

شرکاء ——— (۱) مسز ثریا عندلیب
(۲) خالد سلام (پروفیسر انجینئرنگ یونیورسٹی۔ لاہور)
(۳) ازفر شفقت (ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی)
(۴) مس غزالہ خان (سٹوڈنٹ کنیئرڈ کالج)
(۵) منیر غضنفر (پروفیسر۔ پنجاب یونیورسٹی)
(۶) مس شمیم انور (لیکچرار۔ کنیئرڈ کالج)

دو بچیاں ——— (۱) نجمہ کوثر
(۲) سلمٰی پرویز

ثریا عندلیب

میں کیوں زندہ رہنا چاہتی ہوں

طلوع اسلام کنونشن کی اس مبارک تقریب پر قرآنی نقطۂ نگاہ رکھنے والے بہن بھائیوں کے سامنے میں اپنی اس تمنا کا اظہار نامناسب نہیں سمجھتی کہ میں کیوں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ یہ سن کر آپ مسکرا دیئے! ٹھیک ہے۔ بھلا زندہ رہتے ہوئے کون زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ کوئی انوکھی خواہش تو ہے نہیں یہ بجا فرمایا آپ نے۔ بظاہر یہ ایک معمولی سی بات نظر آتی ہے۔ لیکن حقیقت بین نگاہیں جانتی ہیں کہ زندگی محض سانس کی آمد و رفت کا نام نہیں، یہ تو کچھ اور شے ہے۔

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

(اور میں کیوں زندہ رہنا چاہتی ہوں؟ اس لئے کہ قرآن کریم کی تعلیم نے مجھے انسانی زندگی کے مرتبے سے روشناس کیا ہے۔ اس نورِ مبین نے میری شبِ زندگی کو سپیدۂ سحر میں بدل دیا ہے۔ اس زندہ و پائندہ روشنی نے راہِ ضلالت میں ڈگمگانے والے میرے قدموں کو جادۂ مستقیم پر استقامت کے ساتھ چلنے کی قوت عطا کی ہے۔ اس ازلی و ابدی ضابطۂ حیات انسانی نے مجھے زندگی کی قدر و قیمت سے آگاہ کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ خداوندِ کریم کی دی ہوئی یہ زندگی ایک نعمتِ کبریٰ ہے جس کی حفاظت نہایت ضروری ہے۔

اللہ کے اس نور نے میری جہالت کے اندھیروں کی پیدا کردہ مایوسیوں کو ختم کر کے ہر طرف علم و یقین پر مبنی مستحکم امیدوں کی لازوال روشنی پھیلا دی ہے۔

یہ نورِ خداوندی ان قوانین خداوندی پر مشتمل ہے جن میں خدا کے بندوں کے لئے ایک عظیم الشان پیغامِ حیات ہے۔ یہ پیغام کیا ہے؟ انسان وہ کچھ بن جائے جو کچھ خدا چاہتا ہے کہ یہ بن جائے! خدا نے

اپنی یہ مکمل کتاب اس لئے نازل کی ہے کہ ۔

آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا !

یہ حقیقت مجھ پر واضح ہو گئی ہے کہ ارض و سما کے مالکِ حقیقی نے مجھے اس بیش بہا زندگی کی نعمت سے اس لئے نوازا ہے کہ میں اس کے مقصد کو پورا کرنے کی ذمہ داری کو قبول کر کے اعمال صالحہ کا دامن تھام لوں۔ اور میں اس خوش بختی پر نازاں ہوں کہ رب العالمین نے مجھے اُس امت کا ایک فرد بنایا ہے جو تمام عالم انسانیت میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے ۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۔ اور جس کے متعلق وہ یہ بھی کہتا ہے کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ یعنی تم ایک بہترین قوم ہو جسے نوع انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ بھلائی کیا ہے۔ یہ کہ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ تم ان باتوں کا حکم دیتے ہو جنہیں وحیٔ خداوندی مستحسن قرار دیتی ہے، اور ان سے روکتے ہو جنہیں وہ ناپسند کرتی ہے یعنے مومن کی زندگی اس نصب العین کی حامل ہوتی ہے کہ پہلے وہ اپنی زندگی کو وحیٔ خداوندی کے قالب میں ڈھالتا ہے اور پھر اس نظام کے قیام میں مددگار بنتا ہے جس نظام سے زمین پر خدا کی بادشاہت قائم ہوتی ہے۔

میں بھی زندگی کی بہاروں سے اس لئے شاداب ہونا چاہتی ہوں کہ ان قیمتی لمحات کا حق ادا کر سکوں اور اس ارشاد ربانی کی تصویر بن جاؤں کہ

اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۙ

میری صلوٰۃ اور میری قربانیاں، میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کی رب العالمینی کو عام کرنے کے لئے ہو جائے۔

خود ساختہ مذہب کی دنیا میں صرف اپنی ذات کی نجات کے لئے وعظ ملتے رہے اور فرداً فرداً اخلاقیات کے اسباق کو دہرا لینا کافی سمجھ لیا گیا۔ اس کے بعد جس کا جو جی چاہے مقصدِ حیات متعین کرے ۔ پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا ۔ ایک وہ تھی کھوکھلی عافیت پسندی کی زندگی۔

اس کے بعد زندگی کا رہبر نصیب ہوا اور اس کے توسل سے ذہن نے رُخ موڑا تو قرآن حکیم کے ٹھوس دلائل اور محکم صداقت کی ہمہ گیری نے ان تمام باطل نظریات کو جھٹک کر الگ کر دیا۔ اور وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۔ کے واشگاف الفاظ نے بتا دیا کہ دین اسلام اجتماعی زندگی کی دعوت دیتا ہے اس کے نزدیک مومنین کا نصب العین ایک اور صرف ایک ہوتا ہے۔

یعنی سب کا مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا اور فرقوں میں نہیں بٹ جانا۔ قرآنی فکر رکھنے والے جانتے ہیں کہ اللہ کی رسی سے مراد اس کے قوانین ہیں جو قرآن کے اندر موجود ہیں۔ جو اس لئے موجود ہیں کہ اللہ کے بندے ان قوانینِ الٰہی کو عملی طور پر متشکل کر کے اس زندگی کو جنت بدا ماں بنائیں اور یوں اُخروی جنت کے حق دار بن جائیں۔

خدائے لم یزل کا عطا کردہ یہ دین اہل دنیا کو انفرادی طور پر جینے کا ایسا طریق سکھاتا ہے جس سے اجتماعیت پیدا ہوتی ہے۔ اس نے جماعتِ مومنین کو امت کے خطاب سے سرفراز کیا ہے۔ اس امت کو اجتماعی زندگی کے طور طریقے بتلائے ہیں۔ اور یہ تاکید کی ہے کہ

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ۔

میری جنت میں داخل ہونا چاہتے ہو تو انفرادی زندگی مت بسر کرو۔

میرے بندوں کے ساتھ شامل ہو کر اجتماعی زندگی بسر کرو۔ اس سے تم جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو سکو گے۔ اس دنیا میں بھی اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی ـــ مجھے بھی اس لئے زندہ رہنا ہے کہ میں اس فریضۂ خداوندی کو تا بہ حدِ امکان اور بہ طریقِ احسن پورا کر سکوں۔ مجھ پر تو دوہری ذمہ داری ہے کیونکہ میں اس امت کی ایک فرد ہی نہیں بلکہ خود ایک اُم بھی ہوں اور میں جانتی ہوں کہ کسی امت کی سربلندی کا راز اس کی امہات کے اس حسنِ کردار میں پوشیدہ رہتا ہے جس کا خود نمونہ بن کر وہ اپنی گود کے پالوں کو منزلِ مقصود کی نشان دہی کرتی ہیں اور یوں افرادِ امت صراطِ مستقیم پر گامزن ہو کر صراط الحمید حاصل کرتے ہیں۔

مذہب کے اجارہ داروں نے میرا مقام میری نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا۔ مجھے بلندیوں سے کھینچ کر پستیوں کے گڑھے میں دھکیل دیا تھا۔ دین کی آیات بینات نے میرا چھپا ہوا مقام مجھے واپس دلایا۔ مجھے عورت کی عظمت سے آگاہ کیا۔ امومت کے منصبِ اعلیٰ کے لئے مجھے منتخب کیا۔ اور سچ یوں گویا ہوا۔ ؎

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا دُرِ مکنون!

پھر میں زندگی کی ان حیات آور و درخشاں ساعتوں سے فیض یاب کیوں نہ ہوں، اور جو عظیم ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے اس کو خدا کے پروگرام کے مطابق پورا کرنے کے لئے زندہ رہنے کی تمنا کیوں نہ کروں؟

زندگی عمل سے زندہ رہتی ہے۔ زندگی اور عمل کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور عمل وہ جس سے دنیا کے بگڑے ہوئے معاملات سنور جائیں۔ یہی اعمالِ صالحات قوانینِ خداوندی کے مطابق انسان کی 'تقدیر کا لکھا' بن کر اسے شرف و امتیاز کی زندگی عطا کرتے ہیں۔ ایسی بے مثل نعمت میسر ہوتے ہوئے کس دل میں زندہ رہنے کی آرزو پیدا نہ ہوگی؟

مذہب نے اعمال کی نیکی اور بدی کے نتائج کا اس جیتی جاگتی دنیا سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوئے ان کو محض آخرت کے حوالے کر کے ہمارے لئے خود فریبی میں مبتلا رہنے کی گنجائش پیدا کر دی تھی ۔۔۔ خدا تعالیٰ کی حیات افروز مستقل اقدار کے حامل دین نے اس خود فریبی کے پردوں کو چاک کر کے ہمارا رُخ اس قانون مکافاتِ عمل کی طرف موڑا۔ جو پوری انسانی زندگی پر محیط ہے اور ہمیں بتایا کہ چاہے ہم دنیا کے کسی گوشے میں چلے جائیں، اس ازلی و ابدی قانون کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔ ہمارا ہر قدم قانونِ مکافاتِ عمل کی طرف اٹھتا ہے اور ہمارے ہر عمل کا نتیجہ ہماری ذات پر مرتب ہو کر رہتا ہے۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ؕ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ
اب میں نے جانا کہ یہ حقیقت خدا کی کتاب ہی بتا سکتی تھی کہ دل میں گزرنے والا خیال اور نگاہ کی خیانت بھی نتیجہ پیدا کر کے رہتی ہے۔ اور اگر میں انسانیت کی زندگی بسر کرنے کی متمنی ہوں تو ہر گھڑی مجھے اس بات کو پیش نظر رکھنا ہوگا کہ چاہے کوئی پکڑنے والا ہو یا نہ ہو، کوئی دیکھنے والا ہو یا نہ ہو ۔۔ میرا کوئی عمل نتیجہ پیدا کئے بغیر نہ رہے گا۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ خدا کا دروازہ ہر شخص پر کھلا ہوتا ہے۔ جب تک اس میں عمل کی قوت اور اس کے پاس عمل کا وقت باقی ہے۔ میں زندہ ہوں اور زندہ رہنا چاہتی ہوں تاکہ اعمالِ صالحہ کی روشنی سے معاشرے کی تاریکیاں دور کر سکوں۔

قرآن کریم کی بدولت مجھے یہ ایمان و ایقان حاصل ہوا ہے کہ نور کے آنے سے ظلمات کا پردہ چاک ہو جاتا ہے اور حق کے سامنے باطل نہیں ٹھہر سکتا۔ قرآن یہ اعلان کرتا ہے کہ

جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝

بے شک حق کے سامنے باطل مٹ جانے کے لئے ہی ہوتا ہے۔ یہ اس کا اٹل قانون ہے جسے کوئی بدل نہیں سکتا۔ اس کے پروگرام یعنی قرآن کی رُو سے نظامِ خداوندی کے قیام کی تکمیل ضرور ہوگی۔ اور یہ زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ مگر خدا کے کام اس دنیا میں انسانوں کے دست و بازو سے سرانجام پاتے ہیں۔ اس ذمہ داری کو قبول کئے بغیر مقصدِ انسانیت کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ خدا نے ہمیں اپنی اس زندہ و پائندہ کتاب کا وارث بنایا ہے جو ہمیں یہ نوید دیتی ہے کہ اگر تم ایک قدم

مشیتِ ایزدی کے مطابق اٹھاؤ گے تو نائبِ ایزدی سو قدم آگے بڑھے گی. جب ان نعمتوں کے جلو میں اس زندگی کی ندی رواں دواں ہو تو پھر دل میں حیاتِ جاوداں کی تڑپ کیوں نہ پیدا ہو، اس کیلئے تو میری نگاہ پاک ہو اور میرا حوصلہ بیباک، میرا قلب کشادہ ہو اور میری ہمت بلند، میرا عزم راسخ ہو اور میرا عمل پیہم ــــ تو یہ کائناتی قوتیں میرے سامنے کیوں نہ سجدہ ریز ہوں۔ اور اس کے بعد قانونِ قدرت کے مطابق جب اس دنیا کو چھوڑنے کا وقت آئے تو میں اس اطمینان و سکون کے ساتھ فرشتۂ اجل کو لبیک کہوں کہ میں نے سعی و عمل کے فریضۂ خداوندی کو پورا کرتے ہوئے اس زندگی کا حق ادا کر دیا ــــ اب موت بھی مجھے مار نہیں سکتی میں اب اس کی گرفت سے بالا ہو چکی ہوں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

---

(۲)

خالدِ اسلام

میں کیوں زندہ رہنا چاہتا ہوں؟

مذاکرہ کا موضوع ہے ــــ " میں کیوں زندہ رہنا چاہتا ہوں "

میں نے جب اس کے متعلق سوچنا شروع کیا تو پہلے لفظ "میں" نے میرا دامن پکڑ لیا کہ یہ 'میں' ہے کیا؟

میں سائنس کا سٹوڈنٹ تھا۔ سائنس نے بتایا یہ کہ:۔

زندگی کیا ہے؟ ــــ عناصر میں ظہورِ ترتیب

موت کیا ہے؟ ــــ انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا

ایک ادنیٰ ساجرثومۂ زندگی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا کہیں مچھلی بنا، کہیں مینڈک بنا، کہیں کیڑا کہیں پرندہ بنا کہیں بوزنہ ــــ اس کے بعد اس نے انسان کی شکل اختیار کر لی۔

انسان پر پہلا زمانہ بچپن کا ہوتا ہے۔ نشوونما جسم کی ہوئی تو جوانی آجاتی ہے۔ عمر کے تقاضے سے

بڑھاپا طاری ہو جاتا ہے۔ مشین کے پُرزے گھسنے شروع ہو جاتے ہیں۔ گھستے گھستے ایک دن مشین تھک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

'میں' کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس تصور کے ماتحت اس سوال کا جواب بڑا ہی آسان تھا۔ اس میں کارنمایاں اس سے زیادہ کچھ اور تھے ہی نہیں جنہیں اکبر اس طرح گنا گیا کہ ؎

کیا کہیں احباب کیا کارنمایاں کر گئے
بی۔ اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی، پھر مر گئے

اور زندگی کا مقصد یہ تھا کہ جتنے دن بھی ہیں آرام اور آسائش سے جیا جائے۔

کتنا سہل تھا یہ نسخہ اور کیا آسان اس سوال کا جواب کہ میں کیوں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔

اچھی گذر رہی تھی ـــــ لیکن وہ جو غالب نے کہا ہے کہ

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

یہ پاسبانِ زندگی طلوع اسلام کی پیش کردہ قرآنی فکر تھی۔ اس نے پہلے ہی قدم پر زندگی کے سہانے خواب کو خواب پریشان بنا کر رکھ دیا۔

اس نے کہا کہ یہ جتنی جستجو کر رہے ہو۔ یہ "میں" کے اس پیکر کے متعلق ہے جسے جسم کہا جاتا ہے۔ خود 'میں' کے متعلق کیا کرنا ہے؟

اور جب اس فکر میں آگے بڑھے اک دنیا ہی نئی سامنے آئی۔

قرآن نے بتایا یہ ہے کہ انسان صرف طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی اس میں ہے جسے اس کی ذات یا خودی، نفس یا "میں" کہا جاتا ہے۔

انسان کی ذات بنی بنائی شکل میں نہیں ملتی بلکہ بطور ممکنات زندگی یا مضمر یا خوابیدہ شکل میں ملتی ہے جس طرح جسم کے تقاضے ہیں اسی طرح ذات کے بھی تقاضے ہیں جس طرح جسم کی نشوونما ہوتی ہے اسی طرح ذات کی بھی نشوونما کرنی ہوتی ہے۔ جس طرح جسم کے لئے قوانین مقرر ہیں اسی طرح انسانی ذات کے لئے بھی قوانین مقرر ہیں۔ ان قوانین کو مستقل اقدار انسانیت کہا جاتا ہے جو وحی کے ذریعے ملتے ہیں اور اب قرآن میں محفوظ ہیں۔

قرآن کے فلسفۂ حیات کی رُو سے زندگی CYCLIC ORDER میں نہیں چلتی۔ یہ آواگون کا چکر

نہیں بلکہ زندگی ایک جوئے رواں ہے۔ اس کا دھارا وقت کی طرح پیچھے کی طرف نہیں مڑا کرتا۔ زندگی نے موت کے بعد بھی آگے چلنا ہے لیکن جس قسم کی زندگی یہاں ہوگی اسی قسم کی زندگی موت کے بعد ہوگی۔ (یہاں کا اندھا وہاں بھی اندھا ہوگا)

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (۲۰/۱۲۴)

"جو کوئی قانونِ خداوندی سے اعراض برتے گا تو اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی اور قیامت کے روز اُسے اندھا اٹھایا جائے گا۔

اس لئے یہاں اس قسم کی زندگی بسر کرنی ہوگی کہ اس کے بعد کہیں یہ نہ کہنا پڑے کہ

يٰلَيْتَنِىْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِىْ.

اے کاش! میں اپنی 'میں' کو زندہ رکھنے کے لئے پہلے سے کوئی سامان بھیج دیتا۔

انسانی زندگی کا مقصود انسانی ذات کی خوابیدہ شکل کو مشہود کرنا ہے۔ ذات کی نشو ونما کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص دوسروں سے الگ تھلگ بیٹھ کر چلّے کاٹ کر اور لوجا پاٹ کے زور پر اپنی نجات حاصل کر لے۔ انسانی ذات کی نشو ونما کے لئے قرآن جو پروگرام تجویز کرتا ہے اس کی رُو سے یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک فرد اپنی ذات کی تکمیل میں ایسا جذب ہو جائے کہ وہ دوسروں کی نشو ونما کو نظر انداز کر دے۔ اس کا تو پروگرام ہی یہ ہے کہ جس قدر کوئی فرد دوسروں کی نشو ونما کے لئے دیگا اس کی اپنی ذات کی نشو ونما ہوتی چلی جائے۔

اَلَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (۹۲/۱۸)

وہ شخص جو ہر اس چیز کو جو اس کے پاس ہے دے دیتا ہے اسکی 'میں' کی نشو ونما ہو جاتی ہے، اور اگر اس کی ذات کی نشو ونما ہو جائے تو اس سے انسان اس زندگی سے بلند و بالا زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى . (۸۷/۱۴)

اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی جس نے اپنی 'میں' کی نشو ونما کا سامان کر لیا)

اسی سلسلے میں قرآن کا وحدتِ حیات کا تصور بجائے خویش ایک عظیم اعلان ہے۔ اس نے کہا ہے کہ تمام نوع انسانی اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہے اس لئے تمام روئے زمین کے انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ وہ پورے کے پورے عالم انسانیت کو ایک فرد تسلیم کرتا ہے اور کہتا ہے۔

لَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ ۔ (۳۱/۲۸)

تمہاری (پوری نوعِ انسانی کی) تخلیق اور نشاۃِ ثانیہ ایک فردِ واحد کی سی ہے۔

اس پروگرام کا منتہیٰ یہ ہے کہ تمام نوعِ انسان کو ایک اُمت بنا دیا جائے۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّا اُمَّةً وَاحِدَةً (۱۰/۱۹) ــــ تمام نوعِ انسان ایک امت ہیں ــــ اس مقصد کے حصول کیلئے جس قسم کے نظام کا نقشہ مرتب ہوتا ہے وہ پوری انسانیت کے قیام کا موجب ہے (قِيَامًا لِّلنَّاسِ) اور قرآن اُس عمل کو بقائے دوام کا مستحق قرار دیتا ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۔ (۱۳/۱۷)

قرآن کریم نے اپنے پہلے فقرے "رب العالمین" میں اسی حقیقت کو پیش کیا ہے کہ وہ تمام اقوام و ملل کا نشو و نما دینے والا ہے۔ اس لئے اس نظام میں قومی عصبیت اور جماعتی رجحانات کو دخل نہیں ہو سکتا۔ رب العالمین یا ربوبیتِ عامہ سے مراد یہ ہے کہ ہر فرد کے اندر جس قدر مضمر صلاحیتیں ہیں ان سب کی نشو و نما اس طرح ہوتی جائے کہ وہ اپنی تکمیل کو پہنچ جائیں۔ اس کے معنے تکمیلِ ذات ہیں۔

اس مقصد کے حصول کے لئے ایک ایسی مملکت کی ضرورت ہوتی ہے جو قرآن کی بتائی ہوئی مستقل اقدار کے مطابق معاشرہ متشکل کرے۔ میرا اور تحریکِ طلوعِ اسلام کا یہی نصب العین ہے لیکن یہ آسان کام نہیں ہے۔

'میں' کی حفاظت اور نشو و نما کے لئے قرآن کا تجویز کردہ پروگرام اس کے اپنے الفاظ میں 'پہاڑ کی گھاٹی چڑھنا' ہے جس میں ہر قدم پر انسان کا سانس پھول جاتا ہے اور ہر چار قدم کے بعد اُسے دم لینے کیلئے کھڑے ہونے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے

بچپن کے ساتھی کہتے ہیں کہ ؎

کیوں مرے جاتے ہو ناطقؔ ابھی جلدی کیا ہے
تم نے ہونا ہو تو کھاپی کے مسلمان ہونا!

لیکن ــــ زندگی کی منزل پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یاد رکھو!

جہاں باز و سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

زندگی مسلسل چلتے رہنے کا نام ہے ــــ 'میں' کی حفاظت پیہم سعی و عمل سے ہوتی ہے۔ اس کی حفاظت کے لئے اپنے اندر ہی نہیں باہر کی دنیا میں بھی ایک انقلاب لانا ہوتا ہے ــــ ایسا

انقلاب کہ جس میں غلط معاشرہ کی ہر بساط الٹ کر رہ جاتی ہے۔ اس میں سستانے، دم لینے یا مڑ کر دیکھنے والا کبھی اپنے مقام پر نہیں رہ سکتا۔ زمانے کے تھپیڑے معلوم اسے کتنی دور پھینک دیں۔ یہ زندگی خارا شگافی کی زندگی ہے۔ ؎

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

یہ ہے وہ زندگی جس کے لئے جینے کی آرزو اُس قرآنی فکر نے پیدا کی ہے جس کے بل بوتے پر میں نے اُٹھ کے قدم لئے تھے —— آرزو یہ ہے کہ اب عمر بھر اس آرزو کے بدلنے کی نوبت نہ آئے۔ اور اسی کے لئے میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔

---

(۳)

اظفر شفقت

میں کیوں زندہ رہنا چاہتا ہوں؟

خدا نے انسان کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دے کر اس پر احسان کیا ہے یا زیادتی —— اس کا فیصلہ آپ خود کریں گے۔ بہرحال اگر یہ بدستور جانور کی شکل میں رہتا تو سوچنا تو کجا! اسے جینے کی تگ و تاز بھی برائے نام ہی کرنی ہوتی۔ کیونکہ ہر جانور اپنے آپ کو ماحول کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔

اگر پانی میں ہے تو تیرنے کا ملکہ قدرتی حاصل ہوتا، پرندوں میں شمار ہے، تو ہڈیوں سے گودا غائب تاکہ اڑان میں آسانی ہو۔ سردی پڑی تو حفاظتی جلد مدد کو پہنچی۔ اور جب زندہ رہنے کے لئے لمبے سفر کرنے بھی ہوئے، جیسے مہاجر پرندے، تو قدرت اِن کی رہنمائی اس انداز سے کرتی ہے کہ عقل انسانی حیران رہ جاتی ہے —— خوراک کے لئے بھی لمبے سفر نہیں کرنے پڑتے کیونکہ قدرت انہیں خوراک کے ذخیرے ہی میں پیدا کرتی ہے۔ اور یہ کبھی سننے میں نہیں آیا کہ فلاں شیر یا ہاتھی خوراک کی تلاش میں جرمنی یا ولایت چلا گیا ہو۔ جنگل کے جانور ہوئے تو گوشت خود یا دیگر نباتات حاصل —— ریگستان

میں ہوئے تو خاردار جھاڑیوں پر گزارہ، پانی میں ہوئے تو کیڑے مکوڑے مہیا۔ الغرض قدرت ان کی رہنمائی قدم قدم پر کرتی ہے۔

اِس کے برعکس انسان ہے، جو طاقت میں بہت سے جانوروں سے کم، رفتار میں بہتوں سے کم رفتار ــــ اور اُڑان میں ندارد ــــ لیکن قدرت نے اُسے ایک ایسی خصوصیت مہیا کی ہے جس نے اُسے اشرف المخلوقات کا درجہ دیا۔ یہ ہے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت۔

اس صلاحیت سے انسان نے تاریخ میں کیا کارنامے انجام دیئے یہ موضوع بحث نہیں ــــ میں تو اس وقت اس انسانی صلاحیت کو بروئے کار لاکر آپ سے یہ عرض کروں گا کہ میں کیوں زندہ رہنا چاہتا ہوں ــــ یہ موضوع عرصۂ دراز سے زیر بحث رہا۔ سب سے پرانا ریکارڈ ہمیں اس گفتگو سے ملتا ہے جو مشہور فلسفی سقراط اور Diotima کے درمیان ہوئی ــــ اِس کے بعد گاہے گاہے مدبّروں نے زندہ رہنے کی اہمیت جتائی، فلاسفروں نے زندہ رہنے کے طریقے بتائے۔ سائنسدانوں نے زندہ رہنے کے سامان مہیّا کئے، مصوّروں نے زندگی میں رنگینیاں بھریں اور جب زندگی ان تمام رنگینیوں اور رعنائیوں سے جلوہ گر ہوئی تو انسانیت کی بدقسمتی ہے کہ اس پر مذہب پرست طبقہ نے قبضہ کرلیا اور زندگی کو اپنی اجارہ داری بنالیا۔ یہ فرقہ دوسرے فرقوں پر کیونکر حاوی رہا۔ ہمیں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ــــ اس کی ایک وجہ Eric Hoffer نے اپنی کتاب (THE TRUE BELIEVERS) میں دی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان نے ہر اُس MASS-MOVEMENT) یا عوامی تحریک کو لبیک کہا ہے جس نے اِس انسان کے سوچنے کا ذمہ اپنے اوپر لے لیا اور چونکہ حکمراں اس کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے اور مذہب والوں کا بنیادی اصول وحربہ ہی یہ ہے لہٰذا یہ فرقہ درسب پر قابض ہوگیا۔

جی ہاں تو بات میں سے بات نکل آئی۔ میں کہہ یہ رہا تھا کہ اس فرقہ کی اجارہ داری کا نتیجہ یہ ہوا، کہ انسان کی تمام محنت اور اُس کی تمام (CREATIVE ABILITY) یا تخلیقی قابلیت خود ان کے وضع کردہ خداؤں کی تعریف کی نذر ہوگئی۔ ان خداؤں نے کبھی تو بابل کے Ormazd کا روپ دھارا کبھی یونان کے ZEUS کا، کبھی روم کے JUPITER کا، کبھی ہند کے رام کا اور کبھی SCANDANAVIA کے ODDIN کا۔ اور اب حالت یہ ہوگئی تھی کہ صرف ان آرٹسٹوں کی سرپرستی ہوتی جو ان خداؤں کی تعریف کرتے۔ صرف ان سائنس دانوں کو سراہا جاتا جو ان خداؤں کی باتیں سچ ثابت کرتے۔ صرف ان فلاسفروں کو اہمیت دی جاتی جو ان خداؤں کی تائید کرتے ــــ اس کے ساتھ ساتھ تاریخ نے ایسے نڈر اور باہمت لوگ بھی

دیکھے جنہوں نے اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔ اور قلم، زبان اور تلوار سے اِن قائم شدہ اصولوں کیخلاف احتجاج بھی کیا مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔

اب ہم ان تفاصیل کو چھوڑ اُس دور میں آئیں جبکہ یورپ میں عیسائیت پھیل رہی تھی — وہ عیسائیت نہیں جسے حضرت عیسٰیؑ لائے تھے، بلکہ وہ جسے بعد میں ان کے نام لیواؤں نے وضع کیا تھا۔ اس کے علمبرداروں کا معمول قدیم لوگوں سے زیادہ مختلف نہ تھا اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اب زمانہ کے پینٹروں یعنے مشہور مصوروں MUNELGLORES , BOTULL کی کاوش حضرت عیسٰیؑ کی تصاویر پر صرف ہوئی اور جب GALILIO نے عیسائیت کے وضع کردہ اصولوں کے خلاف آواز اٹھائی تو اس کا جو انجام ہوا وہ سب پر عیاں ہے۔

اس سے ہوتے ہوتے ہم موجودہ دور میں آتے ہیں جہاں دو بنیادی نظام رائج ہیں یعنے کمیونزم یا اشتراکیت اور فلاحی مملکت۔

اس لمبی چوڑی تمہید سے میری مراد یہ تھی کہ چونکہ اب تک عام دنیا کے سامنے صرف یہ دو نظریات ہی ہیں تو ان کی بنیاد کہاں ہے؟ جیسا کہ موجودہ عمرانیات کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کمیونزم اس مذہب پرست فرقے کی اجارہ داری کے خلاف ردِ عمل ہے۔ اِس کی مثال روس ہے جہاں کے انقلاب سے پہلے کی ۹۰ فیصد زمین کسی نہ کسی گرجے کی ملکیت تھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دو نظریات میں سے ایسا کون سا نظریہ ہے جو کہ ایک سوچنے سمجھنے والا انسان اپنے لئے چنے، یعنی اِن دونوں میں سے کس کے لئے زندہ رہے — میں حاضرین! ان دونوں میں سے کسی کے لئے زندہ رہنا پسند نہیں کروں گا۔ میں تو اس تیسرے نظریئے کا حامی ہوں جو ان دونوں پر سبقت لے جاتا ہے۔

اس سے پیشتر کہ میں آپ کے سامنے اپنی زندگی کا مقصد عرض کروں۔ آیئے ذرا ان دونوں نظریوں کو مختصراً جانچیں — ان دونوں میں بنیادی بات جو مشترک ہے وہ یہ ہے کہ دونوں انسان کی جسمانی ضرورت کو پورا کرنے کا بیڑا اُٹھاتے ہیں۔ یہ دونوں فرد کی روٹی، کپڑے کا بندوبست اپنے ذمے لیتے ہیں یعنی وہ ضروریات جو ہماری بحیثیت ایک جاندار کے ہیں اور سب جانداروں میں مشترک ہیں۔

مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ مقصد صرف یہ دریافت کرنا ہے کہ اس کے بعد وہ کیا کہتے ہیں۔ ہم بڑی امید سے اگلی کڑی کے منتظر ہیں۔ مگر صاحب وہاں تو اگلی کڑی ہی غائب ہے۔ اور جو گھبرا کر ہم پوچھ بیٹھیں کہ بھائی اس حیوانی ضرورت کے بعد کیا ہے۔ تو وہ ایک عجیب شان

بے نیازی سے فرماتے ہیں: "اس سے آگے کچھ نہیں۔ زندگی ختم ہوگئی تو کہانی ختم" ـــــ اور ہم شرمندہ سے ہوکر اپنا سر کھجانے لگ جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اگر انسان کا منتہائے زندگی یہی ہے تو انسان اور حیوان میں پھر کیا فرق ہوا اور ہم نے ناحق انسان بننے کی تکلیف کی۔ اس سے تو بندر ہی بھلے۔ نہ فکر نہ فاقہ۔ یہ کھا وہ جا کھیل کود رہے ہیں ـــــ

لیکن حاضرین میرا نظریہ اس سے مختلف ہے۔ وہ انسانی ذات جو مجھے حیوان سے افضل کرتی ہے جس نے مجھے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بخشی ہے اُسے میں یوں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ جسم کی ضرورت بیشک بنیادی ہے اِس کا مجھے انکار نہیں لیکن یہ کہ موت کے ساتھ انسانی ذات ختم ہو جاتی ہے اِس کا مجھے اقرار نہیں

تو قصہ مختصر حاضرین! میں اس لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں تاکہ میں مروں نہ۔ شاید میرا یہ جملہ آپ کو بہت ہی مہمل اور بے معنی دکھائی دے، لیکن ٹھہریئے۔ اس سے پہلے کہ آپ میرے خلاف کوئی فیصلہ صادر فرمادیں پہلے میری پوری بات سن لیں۔

یہ دنیا اور اِس کا کاروبار آئندہ والی دنیا کا وسیلہ ہے۔ موت کے ساتھ ہمارا جسم تو ختم ہو جائے گا۔ لیکن انسانی ذات کو ابھی بہت لمبا سفر کرنا ہوگا۔ یہ ذات آئندہ زندگی میں کیا مقام حاصل کرے گی اس کا انحصار اِس بات پر ہے کہ اِس ذات نے اِس دنیا میں کیا حاصل کیا ہے۔ یعنی جتنی زیادہ اس ذات کی یہاں نشو ونما ہوگی، اُتنا ہی اونچا مقام وہاں حاصل ہوگا۔ اور میں اس لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں تاکہ اِس ذات کی ایسی نشو ونما کروں کہ مجھے موت بھی نہ مار سکے۔ کیونکہ اگر اگلی دنیا میں کوئی مقام حاصل نہ ہوا تو وہ زندگی موت کے برابر ہوگی بلکہ اس سے بھی بدتر ـــــ دوسری بات یہ کہ زندہ رہنے کا جذبہ تو ہر جاندار میں بدرجہ اُتم موجود ہے۔ تو پھر میرا یہ کہنا کہ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں کیا حیثیت رکھتا ہے؟ اس سے میری مراد صرف جسمانی زندگی نہیں بلکہ یہ کہ میں ذہنی طور پر زندہ رہنا چاہتا ہوں تاکہ میں اپنی ذات کی نشو ونما ایسی کروں کہ مجھے موت بھی نہ مار سکے۔

اب شاید آپ کی سمجھ میں میری بات کچھ کچھ آگئی ہو لیکن مزید وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔

انسانی جسم کی نشو ونما جن طریقوں سے ہوتی ہے اس سے ہم سب بخوبی واقف ہیں ۔ ذات کی نشو ونما اس کے برعکس ہوتی ہے۔ جہاں جسمانی سطح پر اپنے لئے کچھ حاصل کرنے سے ہوتا ہے وہ مقام ذات کے لحاظ سے دوسروں کے لئے کچھ حاصل کرنے سے ہوتا ہے۔ یعنے جو میں اپنے اوپر صرف کروں گا اس سے مجھے جسمانی آرام پہنچے گا اور جو میں دوسروں کے لئے صرف کروں گا اس سے میری ذات کو تقویت

پہنچے گی۔ لہٰذا حاضرین میں اپنی ضرورت سے زیادہ محنت کروں گا تاکہ میں زیادہ سے زیادہ اوروں کے لئے مہیا کروں اور اپنی ذات کی بہتر سے بہتر نشوونما کروں۔

اس سے اگلی کڑی ہمیں مستقل اقدار کی طرف لے آتی ہے جن پر عمل پیرا ہو کر میں مندرجہ بالا مقام حاصل کر سکتا ہوں۔ یہ مستقل اقدار وہ اصول ہیں جو خدا نے ہماری رہنمائی کے لئے قرآن کی وساطت سے ہم تک پہنچائے۔

اِن اقدار کے بارے میں دو باتوں کو سامنے رکھئے۔ پہلی یہ کہ یہ اقدار انسان کے لئے ہیں اور حیوانوں کا اِن سے کوئی تعلق نہیں اور دوسری بات یہ کہ اقدار ہمیشہ انسانی معاشرے کے حوالے سے آتے ہیں۔ اگر ایک صاحب کسی غار میں پڑے ہوئے ہیں، کچھ دور ایک اور صاحب دوسرے غار میں پڑے ہیں اور اگر اِن میں سے ایک دوسرے کو ملنے جاتا ہے اور دوسرا اٹھ اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگتا ہے تو ان اقدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ اس سے ان" پہنچے ہوئے" بزرگوں کا پول، جو دور کسی پہاڑ یا جنگل میں یوں پڑے ہیں جیسے خدا پر احسان کر رہے ہوں، پوری طرح کھل جاتا ہے۔

اِن اقدار کی سب سے انوکھی بات یہ ہے کہ یہ انسان کے جسمانی تقاضوں کی اہمیت جانتے ہوئے انسانی ذات پر پوری توجہ دیتے ہیں اور ان اقدار کا نصب العین ذات کی نشوونما ہے۔ اس ضمن میں ایک قدر یاد آگئی جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ ہر انسان کا احترام اس کے انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہے ـــ سوچئے ـــ حاضرین! سوچئے، اس پر عمل پیرا ہو کر ہمارے کتنے مسائل حل ہو جائیں گے۔

خیر جیسا کہ میں پہلے عرض کر رہا تھا میں اس لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں، تاکہ اس قسم کی معاشرے کی تشکیل میں حصہ لوں جہاں یہ اقدار برسرِ عمل ہوں۔ جہاں عورت کی عزت جزوِ ایمان ہو۔ جہاں غربت ناپید ہو، جہاں فرد کی عزت اُس کی کار کی لمبائی یا کوٹھی کی بڑائی پر منحصر نہ ہو، جہاں انسان کی قسمت کسی دوسرے انسان کے ہاتھ میں نہ ہو، جہاں انسانوں کو ایک دوسرے پر اعتبار ہو اور جہاں انسان اپنے علاوہ کسی اور کے لئے بھی سوچ سکے۔

موجودہ نظام میں یہ کام کتنا کٹھن ہے۔ اس سے ہم سب واقف ہیں لیکن یقین مانیئے حاضرین! میں ان ناانصافیوں کے آگے آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالوں گا اور معاشرے میں جتنی بے انصافیاں بڑھ رہی ہیں اتنی ہی میری جینے کی چاہت بڑھ رہی ہے جیسا کہ غالب نے کہا ؎

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

ـــ اور میرا پختہ یقین ہے کہ کوئی مخلصانہ کوشش رائیگاں نہیں جاتی اور اگر ہم فوراً کوئی

بڑا کام سرانجام نہیں دے سکتے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں۔ بلکہ چھوٹی سے چھوٹی کوشش بھی کارآمد ہوگی اور ممکن ہے کہ کسی بڑی حاصل کا پیش خیمہ ہو۔ جس سے ہم بے خبر ہوں۔ ہمیں تو ایمانداری سے اپنا حصہ ادا کر دینا چاہیئے۔ اور میں یہ کہہ دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کوشش کے لئے ضروری نہیں کہ ہم افلاطون کا دماغ، یا ہرکولیس کی طاقت، یا حضرت سلیمانؑ کی دولت رکھتے ہوں۔ ہر انسان میں قوت کا اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ اگر اسے سوچ سمجھ کر استعمال کرے تو ایک انسان پوری کائنات پر حاوی ہو سکتا ہے جیسا کہ کسی شاعر نے فرد کی قوت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے ؎

خود اپنا دل ہی عرصۂ محشر لگا مجھے
میں کیا بلا ہوں رات بڑا ڈر لگا مجھے

اور ہماری تاریخ اس شہادت سے بھری پڑی ہے کہ فردِ واحد نے کیا کیا فتوحات حاصل کیں۔ ان میں سرسیدؒ، ڈاکٹر اقبالؒ، جناحؒ، اور سپرو میز کے نام ہمیشہ کے لئے سرفہرست رہیں گے۔

جس قوم کے سامنے ایسے لیڈر ہوں اس قوم کی آدھی مشکل تو یوں ہی حل ہو گئی اور باقی آدھی کے لئے ہمیں فطرت کی قوت کو تسخیر کرنا ہوگا کیوں کہ اس سے ہم میں وہ استعداد آئے گی جس کے عوض ہم دوسروں کے لئے کچھ کر سکیں گے۔ ورنہ وہی حالت ہوگی کہ پلے نہیں دھیلہ — تے کردی میلہ میلہ!

اب آپ پر مزید واضح ہو چکا ہوگا کہ قرآنی معاشرے کی تشکیل میں ہاتھ بٹانے کے لئے ہی میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ تاکہ مستقل اقدار کو عملاً نافذ کریں اور میری ذات کی بہتر نشو ونما ہو اور مجھے موت کے بعد اس زندگی میں کوئی مقام حاصل ہو۔

اس مقصد کی تکمیل کے لئے میں ہر اس فرد کا اور ہر اس ادارے کا ساتھ دوں گا جو اس معاشرے کی تکمیل میں کوشاں ہے اور حاضرین! جیسا کہ کہتے ہیں — "جاں راہ پئے جانیئے جاں واہ پئے جانیئے" — تو واہ پڑنے سے میں نے دیکھا کہ طلوع اسلام اس مقصد کا حامی ہے لہٰذا میں ہمیشہ طلوع اسلام کے ساتھ رہوں گا۔ اور اس سے مل کر — آپ سے مل کر — اس نظام کیلئے جد وجہد کروں گا جس کا میں نے ابھی ذکر کیا — یہ فیصلہ میں نے کسی وقتی جذبہ کے تحت نہیں کیا۔ بلکہ آرام سے سوچ کر کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ مولوی صاحب یاد آ گئے جنہوں نے ایک روز جوش میں آکر کہا "چلو حج کریں —" دوسرے مولوی صاحب نے پوچھا۔ کہ میاں کیسے جائیں گے؟ تو پہلے فرماتے ہیں کہ پیدل ہی چلیں گے۔ خیر

صاحب دونوں پیدل نکل پڑے۔ جب چلتے چلتے تھک کر نڈھال ہو گئے اور مزید نہ چلا گیا تو ایک صاحب دوسرے سے کہنے لگے کہ بھائی! دیکھنا کہیں مکہ پیچھے تو نہیں رہ گیا۔ میں پرویز صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کبھی ان سے یہ سوال نہیں کروں گا۔

اور حاضرین! قدرت نے ہمارے لئے اس دنیا میں کتنی سہولتیں مہیا کی ہوئی ہیں۔ اس دنیا کی حسین وادیاں اور عظیم پہاڑ، اس کے مصوروں کے شاہکار اور اس کے مصنفوں کی تصانیف، اسکے موسیقاروں کی دھنیں اور اس کی انوکھی مخلوق ـــ یہ سب چیزیں ہمیں زندہ رہنے کے لئے اکساتی ہیں ـــ یہ چیزیں کائنات میں توازن پیدا کرتی ہیں۔ ہم اپنے مقصد کی جدوجہد میں کئی موقعوں پر کسی وقتی رکاوٹ سے دل برداشتہ ہوں گے اور یہ اس وقت ہوں گے جب ہمارے گرد رہنے والے ہماری مخلصانہ دوستی کو شک و شبہ سے دیکھیں گے یا ہماری ہر بات کو غلط معنی پہنائیں گے۔ اس دل شکنی کے وقت یہ مناظرِ قدرت ہماری مدد کو پہنچیں گے اور ہم اپنے دکھ کو بھول کر نئے عزم سے زندگی کا مقابلہ کریں گے۔

یہاں مجھے GEORGE BORROW کی کتاب TRAVEL IN SPAIN یاد آگئی جس میں مصنف نے اپنی اور ایک اندھے خانہ بدوش کی گفتگو لکھی ہے۔ مصنف اس سے پوچھتا ہے کہ تمہیں کیا چیز زندگی کیطرف راغب کرتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ قدرتی مناظر! پھر BORROW اس سے پوچھتا ہے ـــــــ

"WOULD YOU LIKE TO LIVE IN SICKINESS, JASPER"

وہ کہتا ہے — "THERE ARE FLOWERS, BROTHER

"IN BLINDNESS JASPER, THERE IS WIND ON THE HEATH BROTHER.

یعنی اگر میں پھول نہیں دیکھ سکتا تو کیا ہوا۔ ان پھولوں کے اوپر سے جو ہوا آتی ہے وہ مجھے مسرت کا پیغام دیتی ہے۔

اور سچی بات تو یہ ہے حاضرین! کہ اپنا ملک بہت ہی خوبصورت ہے جس میں ہنزہ کی وادیاں، کاغان کے آبشار، سوات کے میدان، سندھ بن کے جنگلات، سلہٹ کے اونچے نیچے ڈھلوان ہمیں دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔ کتنے ہی NANGA PARBET اور RALCHAPOSHI آپ کی توجہ کے لئے بے تاب ہیں۔ ان میں چلنے سے یوں لگتا ہے جیسے ہم BEETHOVEN یا MOZART کی کسی SYMPHONY میں سفر کر رہے ہیں ـــ ان کے علاوہ ہمارا ادب اور ہماری موسیقی کسی سے کم نہیں تو

پھر ہم میں احساس کمتری کیوں ہو ؟

ہم لوگ تو خوش قسمت ہیں حاضرین کہ پرویز صاحب کی وساطت سے ہم ان مستقل اقدار سے روشناس ہو گئے ہیں۔ ان اقدار پر چلنے سے نہ صرف کائنات میں ہی نکھار پیدا ہوگا بلکہ ہماری ذات کی صحیح نشو و نما بھی ہوگی۔ یہ ان اقدار کا دعوٰے ہے۔

اب تو حاضرین یہ دنیا اتنی پسند آگئی، مستقل اقدار کی جستجو اتنی دلکش لگی، یہاں کی مخلوق ایسی بھائی کہ اگر اب خدا نے جلدی واپس بلانے کا ارادہ کیا تو دبے الفاظ میں اس سے کہیں گے کہ ؎

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

(۴)

منیر غضنفر

میں کیوں زندہ رہنا چاہتا ہوں؟

محترمہ صدر، خواتین و حضرات! یہ تو خیر ظاہر ہے کہ زندگی انسان کے اپنے بس میں نہیں موت البتہ کچھ حد تک اس کے بس میں ہے اور یہ کہ ہر آدمی زندگی کو موت پر ترجیح دیتا ہے تا آنکہ زندگی اس حد تک اجیرن نہ ہو جائے کہ اس کی تکلیف آن دیکھے راستے یعنے موت کے خوف پر غالب آجائے۔ لیکن ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آخر زندگی میں وہ کون سی کشش ہے کہ ہم اسے یوں عزیز تر رکھتے ہیں اور وہ کتنی بھی اجیرن کیوں نہ ہو جائے ہم اس سے جدا ہونے پر رضامند نہیں ہوتے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ؎

آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے مجھے

خواتین و حضرات! ارسطو سے لے کر موجودہ زمانے تک تمام فلاسفر اور ان کے نظریات اس بات پر متفق ہیں کہ انسان زندگی کا دامن ہاتھ سے اس لئے نہیں چھوڑتا کہ اسے یا تو مسرت یعنی حقیقی خوشی میسر ہوتی ہے یا اسے اس کے دستیاب ہونے کی امید لگی رہتی ہے۔ اور تو اور صوفیانہ خیالات

کے حامل یعنے Stoics بھی بالآخر اپنے مقصد حیات کی بنیاد اسی دلیل پر رکھتے ہیں۔ کہ ترکِ دنیا دراصل حقیقی خوشی سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ جہاں تک زندگی کے مقصد کا تعلق ہے — یعنی حصولِ مسرت — اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ اختلاف اگر ہو سکتا ہے تو اسی پر کہ یہ مقصد حاصل کیسے ہو۔

آیئے! ہم سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ مسرت جسے حاصلِ زندگی سمجھا جاتا ہے، بالآخر ہے کیا؟ مغرب کی تہذیب نے یہ نظریہ پیش کیا کہ مسرت دراصل مادی خوشی کا نام ہے۔ اگر آپ کے پاس رہنے کو اعلیٰ مکان، کھانے کو اچھی خوراک اور پہننے کو عمدہ کپڑا موجود ہے تو آپ خوش ہیں۔ اور یہ کہ رنج وغم کے دوسرے عوامل یعنی انسانی تعلقات اور آپ کے نظریات وغیرہ بھی بڑی حد تک اس چیز پر منحصر ہیں۔ چنانچہ آج تمام دنیا اسی نظریئے کی تکمیل میں بے حد شد و مد سے مصروف ہے۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ آیا وہ شخص جسے یہ تمام مادی خوشیاں حاصل ہیں مسرت سے ہمکنار ہوتا بھی ہے یا نہیں — حضرات! سویڈن کے عوام کا معیارِ زندگی دنیا میں سب سے اونچا گنا جاتا ہے۔ لیکن اسی سویڈن میں خودکشی کا تناسب (RATE) دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے مغرب میں لوگ عام طور پر خوشحال ہیں اور انہیں بیشتر ضروریاتِ زندگی وافر مقدار میں میسر ہیں۔ لیکن اسی مغرب کے متعلق مشہور فلاسفر RUSSELL کا یہ کہنا ہے کہ چھٹی کے دن لوگ مسرت کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں اور وہ شراب اور جنس (SEX) دو ہی دروازے کھلے پاتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں راستے مسرت نہیں بلکہ حقائق سے فرار مہیا کرتے ہیں ان کے چہرے کی کیفیت RUSSELL اِن الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

A MARK IN EVERY FACE I MEET

MARKS OF WEAKNESS, MARKS OF WOE.

یہ ہے ان لوگوں کی کیفیت جو اس وقت علم و فن کے بلند ترین مقامات پر فائز ہیں اور مسرت کو حاصل کرنے کے لئے مادی عوامل پر بھروسہ کرتے ہیں۔

لیکن مغرب کے متعلق یہ چند الفاظ میں نے مشرق سے موازنہ کے طور پر استعمال نہیں کئے۔ مشرق سے بالعموم مفہوم ہوتا ہے سطحی مذہب پرستی جس کی انتہائی شکل صوفیانہ مسلک ہے۔ آیا یہ مسلک انسان کو حقیقی مسرت مہیا کر دیتا ہے یا انسان کو ایک ابدی خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔ اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں اس کا آپ کو علم ہی ہے۔ جہاں تک مغربی نظامِ معاشرہ کا تعلق ہے

اس کا کھوکھلا پن بھی اب ایک کھلی ہوئی حقیقت بن چکا ہے۔

اب میں پھر اسی نکتہ کی طرف آتا ہوں جہاں سے میں نے بات شروع کی تھی۔ یعنے انسان نے یہ تو سوچ لیا کہ اسے چاہیئے کیا (سوچا کیا یہ تو اس کی جبلت کا تقاضا INSTINCTIVE DRIVE تھی) لیکن وہ صدیوں کی تگ و دو کے بعد بھی یہ نہ جان سکا کہ اُسے حاصل کیسے کیا جا سکتا ہے۔

HAPPINESS یا مسرت دراصل ایک ذہنی اور قلبی کیفیت کا نام ہے۔ مادی اشیا کی دستیابی اُسے بڑھا ضرور سکتی ہے لیکن پیدا نہیں کر سکتی۔

خواتین و حضرات آیئے ذرا دیکھیں وہ ذہنی و قلبی کیفیت کیسے پیدا ہوتی ہے۔ وہ ذہنی و قلبی کیفیت زندگی کو ایک نظم و ضبط کے تابع رکھنے سے پیدا ہوتی ہے جس طرح مادی دنیا میں ترتیب سے حُسن پیدا ہوتا ہے، جس طرح سائنس کا وجود اور اس کی تمام تر ترقی قوانینِ قدرت کی مرہونِ منت ہے، اسی طرح انسانی ذہن عمرانی دنیا میں قانون کی حکمرانی (RULE OF LAW) کی پوجا کرتا ہے اور اندھیر نگری سے دور بھاگتا ہے جس طرح ایک اہم قانونِ قدرت کا انکشاف سائنس کی ترقی کے لئے اَن گنت دروازے کھول دیتا ہے، اسی طرح عمرانی یعنی معاشرتی قوانین کا انکشاف انسانی معاشرتی زندگی کے لئے بے انداز ترقی کے زینے کھول دیتا ہے اور جس طرح مادی دنیا میں قوانینِ قدرت کا انکشاف انسانی ذہن کے لئے باعثِ تسکین ہے اسی طرح عمرانی قوانین یعنے معاشرتی زندگی میں نظم و ترتیب کا انکشاف انسانی ذہن کو ایک ایسی تسکین، ایک ایسی کیفیت سے ہمکنار کر دیتا ہے جسے مسرت یا HAPPINESS کہا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مادی اشیا کی دستیابی HAPPINESS یا حقیقی مسرت کو بڑھا ضرور سکتی ہے پیدا نہیں کر سکتی اور یہی وجہ ہے کہ جسمانی درد یا جیل کی کوٹھڑیاں آپ سے دنیا کی ہر شے چھین سکتی ہیں لیکن حسن و مسرت کا وہ راگ نہیں چھین سکتیں جو آپ کے ذہن میں بس چکا ہو۔ زندگی زنجیروں میں بھی پُر مسرت ہو سکتی ہے۔

چنانچہ خواتین و حضرات اس بات کو مسلمہ جان کر کہ زندگی مسرت کی جستجو کا دوسرا نام ہے انسان نے اس کے حصول کے لئے بے انداز کوشش کی اور نظریات پیش کئے لیکن مسرت ہمیشہ اُس سے دور بھاگتی رہی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس کی تمام تر کوشش مسرت کو بڑھانے کے ذرائع پر مرکوز رہی نہ کہ اُس کے پیدا کرنے پر ـــــ دراصل اس میں انسان کا کچھ اتنا قصور نہ تھا۔ اُسے قدرت نے شاید اتنی نگہ و دور اندیشی عطا ہی نہ کی تھی کہ وہ نہ صرف معاشرتی قوانین کو پہچان لینا

بلکہ اُن کا ایک ایسا مجموعہ تیار کر لیتا جو ہمیشہ اس کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوتا۔ پھر اُسے نہ تو کوئی پریشانی لاحق ہوتی، نہ تذبذب اور نہ خوف۔

—— لیکن —— ایسا نہ ہونا تھا اور نہ ہوا۔ مشکل یہ تھی کہ Physical Science یا خارجی کائنات کے قوانین تو ایسے تجربات سے اخذ کئے جاتے تھے جنہیں بار بار اور مختلف طریقوں سے دُہرا کر اُن کی سچائی اور پائیداری کا امتحان کیا جا سکتا۔ لیکن انسان کی تمدنی زندگی کے قوانین نہ تو لیبارٹری میں اخذ کئے جاتے اور نہ ہی لیبارٹری میں اُن کا امتحان کیا جا سکتا —— ہاں ان کا قدرت کے کارخانے میں حرکت پذیر حالت میں مطالعہ کیا جا سکتا۔ لیکن انسان کی عمر کم تھی اور تجربات عام طور پر لمبے۔ —— ہر چند کہ اس نے تاریخ کی کتابیں مرتب کیں لیکن نہ تو وہ اپنے تجربات کو غیر جانبدارانہ طور پر ریکارڈ ہی کر سکا اور نہ ہی وہ اُن سے واضح قوانین اخذ کر سکا۔ شاید یہ ممکن ہی نہ تھا۔

خواتین و حضرات! جہاں انسان نے مسرت کے حصول کے لئے اتنی کوشش کی اور وہ اُسے حاصل نہ کر سکا وہاں خداوند تعالےٰ نے (کیونکہ آخر اسی نے ہمیں زندگی عطا کی تھی) نہ صرف یہ بصراحت واضح کر دیا کہ حقیقی خوشی کی بنیاد ایک عمرانی (معاشرتی) مجموعہ قوانین پر رکھی جا سکتی ہے بلکہ وہ مجموعہ قوانین ایک مرتب شکل میں اُس کے حوالے بھی کر دیا۔ اور اسے اس بات کی اجازت بھی دے دی کہ وہ چاہے تو اس کا کسی دوسرے مجموعہ قوانین سے موازنہ کر کے جانچ لے۔ اگر چاہے تو اُسے اپنی حقیقت پر مبنی مرتب شدہ تاریخ کی روشنی میں پرکھ لے اور اگر چاہے تو اس کا PRAGMATIC TEST بھی کر لے۔ یعنی اس پر عمل کر کے اس کے نتائج سے اس کی صداقت کی گواہی لے لے۔ اگر اس نے ایسا کیا۔ تو وہ اُسے ہمیشہ اُسی آب و تاب سے چمکتا، دمکتا اور زندگی کے تمام حقائق (FACTS) پر پورا اُترتا ہوا پائے گا۔ اور یہ کہ انسان ان قوانین کی روشنی میں اپنا راستہ ہمیشہ بے خوف و خطر متعین کر سکے گا اور وہ یقیناً کبھی ٹھوکر نہیں کھائے گا۔

تو اب حضرات میں بھی وہی تصورِ جاناں کئے جا رہا ہوں جس کے سہارے آپ سب لوگ جیتے ہیں —— مسرت کے حصول کی امید —— اس دوران جستجو میں نے تھوڑا بہت قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کی بھی کوشش کی ہے اور جہاں تک میری عقل و فکر کا تعلق ہے، میں یہ سمجھا ہوں کہ یہ کتاب نہ صرف ہر انسان کے مقصدِ زندگی کو نکھار کر رکھ دیتی ہے بلکہ اس کے حصول کے لئے ایک بہت ہی سائنٹفک، مدلل اور منظم طریقے کی وضاحت بھی کرتی ہے۔

لیکن —— خواتین و حضرات! قرآنی طریقِ کار اس مقصودِ حیات تک پہنچنے کے لئے ایک

بہت ہی کڑی شرط عاید کرتا ہے۔ بس اسی شرط میں رازِ سربستہ بند ہے۔ وہ راز یہ ہے کہ آپ کی مسرت کا انحصار دوسروں کی مسرت پر ہے اور اس کے لئے ایک ایسے معاشرتی نظام کا قیام ـــــ جس میں ہر فرد کی کوشش یہ ہو کہ وہ دوسروں کو زیادہ سے زیادہ مسرت کس طرح بہم پہنچا سکتا ہے ـــــ لاینفک ہے۔ یہ شرط بہت کڑی ہے لیکن قرآنی طریق سے بہتر حصولِ مسرت کا کوئی طریقِ کار آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ اور پھر یہ ایک ایسا طریقِ کار ہے جس کا امتحان انسان پہلے بھی کر چکا ہے۔ اگرچہ بہت مختصر عرصہ کے لئے ہی سہی لیکن چند انسانوں کی تنگ نظری اور ناعاقبت اندیشی نے انسان کے ہاتھ سے وہ پھل چھین لیا جس کا مزہ وہ ابھی پوری طرح چکھنے بھی نہ پایا تھا۔

خواتین و حضرات! آپ سب کی طرح حصولِ مسرت کا شوق مجھے بھی بیتاب رکھتا ہے۔ میری زندگی کے یہ چند سال بھی مسرت کی جستجو میں گزرے ہیں۔ لیکن جب سے مجھے اس کی اصل حقیقت اور حصول کا یقینی طریقِ کار معلوم ہوا ہے میرا شوقِ نظارہ عشق کی حد تک پہنچ گیا ہے اور میں نے وصل کی وہ کڑی شرط پوری کرنے کی پوری کوشش کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے جس کے بغیر حصولِ مسرت ممکن نہیں۔ یعنی قرآنی نظامِ ربوبیت کا قیام!

قرآنی نظامِ معاشرہ کی بنیاد احترامِ انسانیت ہے اور دوسری چیز پہلے تو قدرت کی قوتوں کی تسخیر، اور پھر ہر فرد کو اس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی بغیر جگر پاش مشقتوں کے بہم پہنچانا ہے۔ اور وہ بھی اس انداز سے کہ اس کے بدلے میں معاوضہ لینا تو درکنار شکریہ تک کی بھی تمنا دل میں پیدا نہ ہو۔ اس لئے کہ حصولِ مسرت کے لئے جو کچھ کیا جائے اس کا معاوضہ خارج سے نہیں انسان کے اندر سے ملتا ہے۔ ؎

جنت تیری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

ـــــ مجھے یقین ہے کہ جب نگاہوں کا زاویہ اس انداز سے بدل جائے تو انسان کو ہر سانس میں مسرت حاصل ہوتی چلی جاتی ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ مستقبل کی باتیں ہیں اور راستہ بڑا کٹھن اور اس قدر کٹھن کہ ایسے موقعے بھی آتے ہیں جب امید کا دیا ٹمٹماتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن جوں جوں منزل کٹھن ہوتی چلی جاتی ہے، کہیں ویرانے سے یہ آواز اور ابھرتی چلی جاتی ہے کہ زندگی اس گدلی اور کثیف فضا، اس گھٹن اور سرد مہری کی کشمکش کا نام نہیں۔ وہ تو حسن و مسرت کا ایک لطیف امتزاج ہے ـــ اور زندگی ناہمواریوں اور غیر متوازن کیفیت کو بدلنے کے لئے زندہ رہنے کا اور موت سے لڑنے کا نام ہے۔

خواتین و حضرات ۔ حال کی تلخیاں مستقبل کی عظمتوں اور تابناکیوں کو اور بھی روشن کر دیتی ہیں اور میرے اس یقینِ محکم کو محکم تر بنا دیتی ہیں کہ ؎

سرخ پھولوں کا بڑے ناز سے گوندھے ہوئے ہار
کل اسی خاک پہ گلرنگ سحر آئے گی!!

اسی گلرنگ سحر کی امید سے میری زندگی وابستہ ہے اور میں اسی کے لئے جینا چاہتا ہوں۔

محترمہ صدر! آج کے اجلاس میں ہمارے فلسطین کے چند مسلمان بھائی بھی موجود ہیں جو اردو نہیں سمجھتے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اُن کے لئے چند الفاظ انگریزی میں بھی عرض کر دوں۔

---

(۵)

مس غزالہ خان

میں کیوں زندہ رہنا چاہتی ہوں؟

انگریزی تقریر کا رواں ترجمہ

میں لاہور میں رہتی ہوں ۔ اُس لاہور میں جو بظاہر تو ایک شہر ہی ہے۔ لیکن جو درحقیقت بدلنے والے موسموں کا ایک حسین مرقع ہے۔ آجکل یہاں موسم بہار انتہائی شباب پر ہے جس میں زندگی اپنی بھرپور شادابیوں اور رعنائیوں کے ساتھ کہیں قہقہے لگاتی اور کہیں مسکراتی نظر آتی ہے۔ ذرا ان شگفتہ و نورستہ پھولوں پر نگاہ ڈالئے۔ ان کی لطافتیں اور رنگینیاں کس طرح فردوسِ نگاہ بنتی ہیں اور پھر ان کی شمیم جاں نواز سے لطف اندوز ہوجیے جو کیف و نشاط کی ایک جنت اپنے جلو میں لئے روش روش مستانہ وار محوِ رقص ہے ۔ اقبالؒ نے کسی ایسے ہی دلکش منظر کو دیکھ کر بیساختہ کہا تھا۔

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن

لیکن ہمیں اس پری خانہ کے لئے جانبِ صحرا جانے کی ضرورت نہیں۔ یونہی چار قدم چل کر ذرا باغِ جناح میں جا نکلیئے۔ یہ پریاں آپ کے لئے پرفشاں نظر آئیں گی۔ اس کے ایک گوشے میں "گلستانِ فاطمہ" پر نگاہ ڈالیئے۔ غالبؔ کا تصوراتی "دامانِ باغبان وکفِ گل فروش" ہر نگہ حسن شناس کو ایک زندہ حقیقت کی شکل میں دعوتِ نظارہ دے گا — ہر سمت طرب انگیزیاں — ہر جانب نشاط آمیزیاں!

خیام کہیگا کہ یہ بہار اور اس کی رنگینیاں سب فانی ہیں۔ یہ آج ہیں اور کل کو نہیں رہیں گی۔ لیکن میرے لئے یہی چیز زندہ رہنے کی محرک بنتی ہے۔ اس بہار کی رعنائیوں کو میں نے اپنے دامنِ نگاہ میں سمیٹ لیا ہے۔ جب یہ کل کو باقی نہیں رہیں گی تو میں آئندہ سال کے موسمِ بہار کے انتظار میں زندہ رہوں گی۔ خیام کو کون بتلائے کہ حسنِ کائنات کی دلآویزیاں ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہیں، فنا نہیں ہوتیں۔ وہ جاتی ہیں دوبارہ آنے کے لئے۔ اور ان کے دوبارہ آنے کی امید ہی تو ہے جو زندگی کو اس قدر پُرکیف بنائے رکھتی ہے۔ اس راز کو خیام نے نہیں، غالبؔ نے سمجھا تھا جب اُس نے کہا تھا کہ ؎

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

میں ایک طالب علم ہوں اور زندگی کے بھرپور خزانہ کی تلاش میں سرگرم سفر رہنا میرا مقصودِ حیات ہے — مسلسل سفر — پیہم سفر — کہ حیات، ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں؛ نہ یہ خزانہ سراب ہے اور نہ ہی اس کی تلاش میں میری کوششیں خود فریبی۔ وہ بھی حقیقت ہے اور یہ بھی مبنی بر حقیقت — میرا مقصد بھی سچا ہے اور اس کے حصول کے لئے میری تڑپ بھی سچی۔ میں اس مقصد کو کتابوں کے ذریعے تلاش کرتی ہوں اور دنیا کے عظیم مفکر، شاعر، مؤرخ، دیدہ ور، موسیقا، مصوّر مجسمہ تراش، تعمیر ساز، سائنٹسٹ — مختصراً دنیا کے ہر زمانے اور ہر ملک کے عظیم انسان اس سفر میں میرے راہ نما ہیں۔ علم کی وادیاں حدود نا آشنا ہیں۔ اور جس حد تک پہنچنا بھی انسان کے بس میں ہے میں اس حد تک پہنچنے کی آرزو دل میں لئے ہوں — کیسی حسین ہے میری یہ آرزو!

ہمارے زمانے میں، انسان فضا کی لامتناہی وسعتوں کو مسخر کر رہا ہے اور فطرت اس کے سامنے

اپنے سربستہ راز بے نقاب کئے جا رہی ہے۔ میں تسخیر کائنات کے سلسلہ میں انسان کی کامیابیوں کے متعلق زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنا اور فطرت کی عظمتوں سے بیش از بیش روشناس ہونا چاہتی ہوں۔ میں اس خدائے بزرگ و برتر کے متعلق بھی صحیح علم حاصل کرنا چاہتی ہوں جس کا ارادہ رگِ حیات میں خونِ زندگی بن کر دوڑتا ہے۔ جس نے اس ہمہ تن معمہ کائنات کو ایک عظیم مقصد کے لئے پیدا کیا ہے — ہو سکتا ہے کہ خدا کے متعلق اس قسم کا علم حاصل کرنے کی میری شدتِ آرزو کسی دن سربستہ رازوں کے اس دروازہ کو کھول دے اور میں سرچشمۂ جمالِ کائنات کی ایک جھلک دیکھ پاؤں — میں، حسن، صداقت، اور حقیقت کی ایک جھلک — اور صرف ایک جھلک دیکھنے کے لئے زندہ رہنا چاہتی ہوں۔

انسان نے کائنات کی نئی توانائیوں کا راز پا لیا ہے۔ اس نے ایٹم کی لامتناہی قوت کا انکشاف کر لیا ہے لیکن یہ حقیقت کس قدر حسرت ناک اور الم انگیز ہے کہ وہ ان قوتوں کو خود اپنی تباہی کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ میں اس لئے زندہ رہنا چاہتی ہوں کہ انسان کو اس کی موجودہ حیوانی سطح سے ابھر کر انسانیت کی سطح پر آتے، اور اپنی حماقتوں پر نادم ہوتے دیکھ سکوں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب انسان کو اپنی اس تخریبی ذہنیت کا احساس ہوگا اور وہ فطرت کی ان بے پناہ قوتوں کو انسانیت ساز مقاصد کے لئے استعمال کریگا۔ میں اس دن کی انتظار میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔

اس حقیقت کے اعتراف و اظہار پر میرا سر نیاز بدرگاہِ رب العزت جھک جاتا ہے کہ اس نے مجھے ایک ایسے گھرانے میں پیدا کیا جس میں مجھے وہ سب کچھ حاصل ہے جس کی آرزو انسان کر سکتا ہے — محبت اور خلوص — ماں باپ کی بے غرض محبت — بہن بھائیوں کا سچا پیار — اس سے زیادہ انسان کو اور چاہیئے کیا؟ میں زندہ رہنا چاہتی ہوں تاکہ اپنے گھر کی اس چھوٹی سی حسین جنت کی سکون افزائیوں سے زیادہ سے زیادہ بہرہ یاب ہو سکوں اور اس طرح سمجھ لوں کہ بے لوث محبت، اور بے غرض صداقت کسے کہتے ہیں۔

اس دنیا میں مختلف قسم کے آرٹ اور فن کے ہزاروں نادر شاہکار بکھرے پڑے ہیں — پیرس

کی متبسم مونالیزا — میڈرڈ میں حیرت فروش مایا — برلن میں محوِ خواب (NEFIRTITE) نفرٹائٹ کی ممی — اور لاہور میں متلاشیٔ حقیقت، فاقہ کش بدھ کا مجسمہ — قاہرہ میں محیر العقول اہرام — آگرہ میں نورِ وحدت ..... کی داستانِ خموش، تاج محل — چین کی ہوش ربا دیوار — یونان اور روم میں قدیم تہذیبوں کے مدفن — ہڑپا اور موہن جودارو کے عہدِ کہن کے بھولے ہوئے افسانوں کی یاد دلانے والے کھنڈرات — جنوبی امریکہ کی اِنکا " تہذیب کے انمٹ نقوش — میں ان تمام ممالک میں جانا چاہتی ہوں۔ تاکہ میں آدم کی کہانی، ان یادگاروں کی زبانی خود اپنے کانوں سے سنوں۔

میں ماسکو کی بالشوئی تھیٹر میں جانا چاہتی ہوں تاکہ وہاں راج ہنس (SWAN LAKE) کے رقص کا شعلۂ جوالہ اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ یا پھر لندن جاکر (MARGOT FONTYN) کو دیکھوں کہ وہ ہنس کے رقصِ بسمل کو کس طرح ایک زندہ دلآویز حقیقت میں بدل دیتی ہے — میں پاکستان کی اس محفلِ موسیقی میں بھی شرکت کرنا چاہتی ہوں جہاں ملکۂ موسیقی روشن آرا بیگم خیال، چاندنی کیدارا کے بعد، جھنجوٹی کی ٹھمری — پیا بن نا ہیں آوت چین — سے زہرۂ فلک کو آسمان کی بلندیوں سے اتار کر فرشِ زمین پر لے آتی ہے۔ اور ہر قلبِ حساس بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ ؎

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو!

میں ان مقدس سرزمینوں کی یاترا کو جانا چاہتی ہوں جہاں نظام الدین اولیاء، رومی، غزالی اقبال، سعدی، شیکسپیئر، آئن سٹائن اور ابن سینا محوِ استراحت ہیں۔ میں ان زیارت گاہوں میں جاکر، ان کی پاکیزہ یاد کے حضور اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کرنا چاہتی ہوں۔ ان مقامات کی فضا یقیناً زندگی سے بھرپور ہوگی اور اس میں سانس لینے سے میری آرزوؤں کو بھی وہی حرارت اور تابندگی حاصل ہوسکے گی جس کے پیکر تاریخِ انسانیت کی مایہ ناز ہستیاں تھیں۔ ان مقامات کی یاترا سے میرا مقصود یہی ہے۔

اور میری آخری آرزو یہ ہے — وہ آرزو کہ جس کے حصول کے بعد کوئی اور آرزو باقی نہیں رہ جاتی کہ — لیکن اس آرزو کو لب تک لانے سے پہلے زبان کو کوثر و تسنیم کے آبِ مطہر سے دھونا ضروری ہے، اور اس بارگاہِ عظمت مآب میں انتہائی عجز و نیاز کے ساتھ جبینِ شوق کو جھکانا لازمی — کہ

میں اُس خاکِ حجاز کے مقدس ذروں کو اپنی مژگانِ عقیدت سے چوم لینے کی مسرت حاصل کرلوں جس خاک نے اس عظیم سے عظیم تر۔ اس حکیم سے حکیم تر ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے جسدِ مقدس کو اپنے آغوش میں لینے کی سعادت حاصل کر رکھی ہے، جس کے متعلق میرا ایمان ہے کہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!

وہ ذاتِ گرامی کہ آسمان کے بلند ترین ستاروں کے لئے جس کی پا بوسی کا فخر باعثِ صد ہزار سعادت ہے۔ وہ حاصلِ کائنات کہ جس پر خدائے بزرگ و برتر نے اپنا آخری کلام نازل کیا — میری انتہائی آرزو یہ ہے کہ مجھے ان خاک کے ذرّوں کا قرب حاصل ہو جائے — بس ایک بار — نہیں۔! بار بار — صد ہزار بار —!

میرے دل میں اس زبدۂ انسانیت ذاتِ گرامیؐ کا بے پایاں ادب و احترام اس لئے ہے کہ اس نے ہمیں اس کتابِ عظیم سے فیضیاب ہونے کی سعادت عطا فرمائی۔ جو صداقتِ مطلق کی امین ہے۔ وہ صداقت جس کا ادراک میری زندگی کا آخری مقصد ہے۔ میں اس کتابِ عظیم کے حقائق کا علم حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ تاکہ میں اس کے پیغام کی شمعِ نورانی کو لیکر دنیا کے گوشے گوشے میں بکھروں اور باطل کی ہر قسم کی تاریکیوں کو دور کرتی چلی جاؤں — کیسی عظیم ہے یہ کتاب اور کس قدر بلند ہے اس کا پیغام — اگر نوعِ انسان اس کے پیغام کو سمجھ کر اسے زندگی کا نصب العین بنالے تو آج ہی دنیا سے محتاجی اور ناداری — ہر نوع کی غلامی اور ظلم و استبداد کا خاتمہ ہو جائے۔ اور منافقت، بیہودگی اور سلب و نہب کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔ میں اس پیغام کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ اور اپنے فکر و عمل کو اسوۂ رسول اللہؐ کے حسین و جمیل قالب میں ڈھالنے کی آرزومند ہوں۔ یہی ایک طریق ہے جس سے میں ایسی زندگی بسر کر سکتی ہوں جس میں نہ یاس و ناامیدی کا گزر ہو، نہ خوف و حزن کا سایہ — میں اس قسم کی درخشندہ امیدوں بھری زندگی کے لئے جینا چاہتی ہوں — یہی میری آرزوؤں کا منتہیٰ ہے۔

میں چاہتی ہوں کہ میں اسی مقصد کے لئے زندہ رہوں — اور جب عقلِ حیلہ جو مجھے آگے بڑھکر کہے کہ تمہاری یہ آرزو خلافِ منطق جذباتیت ہے تو میں اسے پوری جرأت و بسالت سے کہہ سکوں کہ ہاں! میں زندگی کی حقیقی مسرتوں کی خاطر زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ اور اگر میری یہ آرزو تیرے پیمانوں پر پوری نہیں اترتی تو تو جا — اور اپنے ان پیمانوں کے لئے کوئی اور گوشہ تلاش کر۔ کہ میرے نزدیک —

حیات، سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں!

(مس شمیم انور)

(۶)

میں کیوں زندہ رہنا چاہتی ہوں؟

(انگریزی تقریر کا رواں ترجمہ)

محترمہ صدرِ بزم — خواتین و حضرات!

اس مذاکرہ کے سلسلہ میں جب سے یہ سوال میرے سامنے آیا ہے کہ "میں کیوں زندہ رہنا چاہتی ہوں؟" میں سوچ رہی ہوں کہ کیا مجھے اس کا علم بھی ہے کہ "زندہ رہنے" سے مفہوم کیا ہے؟ کیا میں کبھی زندہ رہی بھی ہوں؟ کیا میں اب بھی زندہ ہوں؟ زندگی کے متعلق ایک تصور رکھنا اور بات ہے اور اس تصور کے مطابق زندگی بسر کرنا دوسری بات. قرآن کریم نے ہمیں زندگی کا ایک خاص تصور اور اسے ماپنے کا ایک پیمانہ دیا ہے جس کی رُو سے، انسانی سطحِ زندگی اور اس سے نیچے کی مخلوق کی سطحِ حیات نکھر اور ابھر کر سامنے آجاتی ہے. ہمیں اس کا تو علم ہے کہ قرآن کا عطا کردہ یہ تصور، اور یہ پیمانہ کیا ہے. لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم کبھی اس تصور کے مطابق زندہ رہے ہیں. اور کیا ہم نے کبھی اپنی زندگی کو اس پیمانے کے مطابق ماپا ہے؟ کیا ہم کبھی انسانی سطحِ زندگی کی کیفیات سے لذت یاب ہوئے ہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ کیفِ زندگی سے وہی لذت آشنا ہو سکتا ہے جس نے ان تصورات کے مطابق کبھی زندگی بسر کی ہو. اس کا چیلنج یہ ہے کہ

ذوقِ ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نچشی

لہٰذا، خواتین و حضرات! یہ کہنے کا حق کہ "میں زندہ ہوں" صرف اسی کو ہو سکتا ہے جس نے کبھی زندگی کو محسوس کیا ہو. اور زندگی کو محسوس وہی کر سکتا ہے جس نے کبھی قرآنی تصور کے مطابق انسان کی سطح پر زندگی بسر کی ہو. اور یہی وہ مقام ہے جہاں اصل دشواری پیش آتی ہے. سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں اس سطح پر زندگی کے دن گزارنے کا کبھی تجربہ بھی ہوا ہے؟ اور اگر ایسا تجربہ نہیں ہوا تو پھر میں یہ کیسے کہہ سکتی ہوں کہ "میں زندہ رہنا چاہتی ہوں"؟ "چاہنے" کا سوال تو اس کے لئے پیدا ہو سکتا ہے جو جانتا ہو کہ وہ کیا چاہتا ہے؟

زندگی — اقبال کے الفاظ میں — نفس شماری کا نام نہیں، نفس گدازی کا نام ہے۔ جو نفس گدازی کی لذتوں سے کیف یاب ہی نہیں، اس کا یہ کہنا کہ "میں زندہ رہنا چاہتا ہوں" چند سنے سنائے الفاظ کے دھرا دینے سے زیادہ کچھ نہیں۔ اسے یہ نہیں کہنا چاہیئے کہ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اسے کہنا چاہیئے کہ میں سانس لیتے رہنا چاہتا ہوں۔

پھر خواتین و حضرات! اگر یہ نفس گدازی کی زندگی، اگر انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے کی کیفیات سے لذت گیری کسی ایک فرد کے بس کی بات ہوتی۔ اگر ہم اسے، باقی افرادِ معاشرہ سے الگ تھلگ رہ کر، اپنی خلوت کی تنہائیوں میں اپنے طور پر حاصل کر سکتے، تو بھی بات کچھ ایسی مشکل نہ ہوتی۔ جو اس ذوقِ بادہ سے لذت آشنا ہونا چاہتا وہ اپنے طور پر اس کے لئے کوشش کر لیتا، لیکن یہ ناممکن ہے۔ ہم دیگر افراد معاشرہ سے الگ رہ کر اس سے کیف اندوز ہو ہی نہیں سکتے۔ ہم اکیلے بیٹھ کر رو تو سکتے ہیں — ہنس نہیں سکتے۔ اکیلے بیٹھا ہنسنے والا پاگل نظر آتا ہے۔

لیکن ہمارے موجودہ معاشرہ میں ہر فرد اکیلا زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہاں صرف افراد بستے ہیں، معاشرہ کا وجود ہی نہیں۔ یہاں ہر مسافر، کارواں سے کٹ کر، اپنے اپنے راستے پر چل رہا ہے۔ یہاں ہر ایک کی راہ الگ اور ہر ایک کی منزل جدا ہے۔ ہم اُن بستیوں میں بس رہے ہیں جہاں کوئی ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتا۔ ہم میں سے ہر ایک "غریب شہر" ہے۔ ہم ایک ایسی ٹیم ہیں جس کا ہر کھلاڑی مختلف سمتوں میں بال کو کِک لگاتا ہے — وہ ٹیم جس کے سامنے کوئی مشترکہ گول نہیں۔ کوئی متعدہ نصب العین نہیں — ہمارے مفادات، ہماری اقدار، ہماری منزلیں — سب الگ الگ ہیں۔ ان کا کوئی نقطۂ اتصال ہی نہیں وہ کہیں جا کر ایک دوسرے سے ملتی ہی نہیں۔ ہم میں سے ہر ایک، اس قدر انبوہِ کثیر کے اندر رہتا ہوا بھی اپنے آپ کو تنہا پاتا اور تنہا محسوس کرتا ہے — ہم، رابنسن کروسو کی طرح انسانوں کے ایک حدود فراموش سمندر کے اندر اپنے اپنے تصورات کے جزیروں میں تنہا زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم جس دنیا میں زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں وہ ایک ایسا جیلخانہ ہے جس کا ہر قیدی اپنے اپنے ذہن و خیال کی کالی کوٹھڑی میں قیدِ تنہائی کی سزا بھگت رہا ہے۔ ؎

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
مشرق کے ثوابت ہوں کہ مغرب کے ہوں سیّار

جب قرآن کریم ہمیں ایک مشترکہ منزلِ انسانیت کی طرف آواز دیتا ہے تو ہم اپنی انفرادی مفاد پرستیوں کے شور و شغب میں اس قدر کھوئے ہوئے ہیں کہ اس کی آواز ہمارے دل کی گہرائیوں تک پہنچ

ہی نہیں پاتی ___ وہ فضا میں تیرتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے۔ ہم اسے یوں سنتے ہیں جیسے وہ کسی اور کو بلا رہا ہو ___ !

لیکن اس آواز نے ایک بار ہمارے دل کے تاروں کو ضرور چھوڑا ہے ___ ہم ایک بار زندگی کی کیف باریوں سے لذت یاب ضرور ہوئے ہیں۔ ہم نے ایک بار ضرور محسوس کیا ہے کہ زندگی کسے کہتے ہیں اور زندہ کہلانے کے مستحق کون ہیں ___ اور یہ کوئی دور کی بات نہیں ابھی کل کی بات ہے جب نورجہاں کی شعلہ صفت آواز میں ملی ترانے کا ایک بول، کروڑوں دلوں میں ارتعاش پیدا کر کے، انہیں یکسر ہم آہنگ کر دیتا، اور جوشِ نشاط کی وہ کیفیت پیدا کر دیتا جس سے ہم اس سے پہلے کبھی لذت آشنا نہیں ہوئے تھے، یہ آرزو میرے دل کی گہرائیوں سے بار بار ابھرتی ہے کہ اے کاش! وہ دن کہیں پھر سے لوٹ آئیں! میری اس آرزو کے اظہار پر کئی چہروں پر استہزا کی ہنسی پھیل جاتی ہے ___ شروع شروع میں، خود مجھے بھی اپنی یہ آرزو کچھ عجیب سی دکھائی دیا کرتی تھی ___ مجھ سے اکثر کہا جاتا کہ چونکہ تم جنگ کی تباہ کاریوں سے براہ راست متاثر نہیں ہوئی ہو، اس لئے تم اس انداز سے سوچتی ہو، ورنہ جنگ بھی کوئی ایسا تماشا ہے جسے بار بار دیکھنے کی تمنا کی جا سکے؟ ایسا کہا جا سکتا ہے۔ یہ درست ہو سکتا ہے۔ لیکن میں اب محسوس کرتی ہوں کہ میری یہ آرزو اُن لمحات کو پھر سے واپس بلانے کے لئے ہے جن میں دس کروڑ نفوس کے دل کامل ہم آہنگی سے دھڑکتے تھے۔ جب ان کا ردِ عمل ایک تھا اور اس ردِ عمل کی شدت ایک جیسی تھی۔ جب وہ ایک آواز پر اٹھتے اور ایک آواز پہ بیٹھتے تھے ___ جب وہ ایک مقصد کے لئے سوتے، اور ایک مقصد کے لئے جاگتے تھے۔ نہیں! جب وہ ایک مقصد کے لئے جیتے اور ایک مقصد کے لئے مرتے تھے ___ اُف! کس قدر نشاط انگیز تھی کروڑوں دلوں کی یہ ہم آہنگی ___ کیسی مسرت خیز تھی لاکھوں سازوں سے نکلنے والی یہ ایک صدا ___ کیسی وجد آور تھی یک نگہی و یک رنگی کے "بیتھوون" کی یہ فردوسِ گوش (SYMPHONY) ___ کیسے حسین تھے ___ باہزاراں چشم بودن یک نگاہ ___ کے یہ سحر آفریں لمحات!

اب جبکہ وہ صدائیں فضا کی پہنائیوں میں گم ہو گئیں ہیں میں پھر سے اپنے آپ کو تنہا پاتی، اور اداس محسوس کرتی ہوں ___ ایک میں ہی نہیں، ساری کی ساری قوم پھر سے اپنے آپ کو تنہا پاتی اور اداس محسوس کرتی ہے، اس لئے کہ یہ پھر سے اپنی اُس پہلی زندگی کی طرف لوٹ گئی ہے ___ وہی انفرادی مفاد پرستی اور خود غرضی کی زندگی ___ وہی ایک دوسرے سے ٹکرانے والی قدروں اور مختلف منزلوں کی طرف لے جانے والے راستوں کی زندگی۔

میں اکثر سوچتی ہوں کہ اس قسم کی یک نگہی اور ہم آہنگی کی زندگی، جنگ کے سے پُرخطر زمانے میں ایسی وجد آور اور طرب انگیز تھی، تو وہ حالتِ امن میں کیسی نشاط آور اور بہار آفریں ہوگی! اے کاش! مجھے وہ اندازِ ریست کہیں مستقل طور پر میسر آجائے۔!

لیکن وہ مجھے تنہا کیسے میسر آجائے؟۔ وہ تو اسی صورت میں میسر آسکتا ہے جب، سب کے سب اُس انداز کی زندگی بسر کریں۔ اور یہ میرے بس کی بات نہیں۔ ایک نئے نواز اکیلا (SYMPHONY) پیدا نہیں کر سکتا۔ اس مجبوری اور بے بسی کی بھی کوئی انتہا ہے؟ اب پھر وہی میں ہوں، اور وہی شہرِ خموشاں!! ؎

گذاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انہی کی یاد میری زندگی ہے

اب جو یک نگہی اور ہم آہنگی کے وہ حیات بخش لمحات گذر چکے ہیں، معاشرہ میں پھر وہی نفسا نفسی شروع ہو گئی ہے۔ اب پھر پہلے کی طرح، ہر سینے میں دل الگ الگ انداز سے دھڑکتا ہے۔ بالکل منفرد۔ باقی دلوں سے یکسر بیگانہ۔ اس کے مقاصد بھی الگ، ان کے حصول کے طریق بھی جداگانہ!

وہ مقصد ہے کیا جس کے لئے اب ہم مصروفِ تگ و تاز ہیں۔! ہمارے منصوبے، ہماری اسکیمیں ہماری کوششیں، ہمارے خدشات، ہماری پریشانی کا ہے کے لئے ہیں؟ ہماری تمام سعی و کاوش کا منتہیٰ کیا ہے؟ ہماری تگ و تاز کی منزل کون سی ہے؟۔ اس کا جواب بالکل صاف اور واضح ہے۔ یہ سب، طبیعی زندگی کی ضروریات کے لئے وقف ہیں۔ روٹی، کپڑا، مکان۔ نفس شماری کی زندگی کے سہارے، حیوانی سطح پر جینے کا سامان۔ اب ہماری تمام جد و جہد کا منتہیٰ یہی ہے۔ "اس وقت تو کھانے کو مل گیا ہے، کل کو کیا ہوگا" اس کی فکر ہر ذہن کو پریشان کئے ہوئے ہے۔ جو کوئی سوچتا ہے تو اسی کے لئے سوچتا ہے۔ جو کوئی کام کرتا ہے تو اسی کے لئے کرتا ہے۔ جو پریشان ہے وہ اسی کی وجہ سے پریشان ہے اور جو خوش ہے تو محض اس لئے کہ اسے یہ کچھ حاصل ہو گیا ہے! ہماری سیاسی معاشی، معاشرتی زندگی کا سارا تانا بانا انہی خدشات اور انہی خطرات سے بُنا جاتا ہے۔ اس لئے کہ ہمیں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر کل کو ہمیں کچھ ہو گیا تو ہمیں کھانے کو کہاں سے ملے گا۔ اسی پریشانی کی وجہ سے ہم ہر وقت اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں کہ ہم کس طرح زیادہ سے زیادہ جمع کر سکیں زیادہ سے زیادہ ذخیرہ اندوزی کر سکیں۔ جائز اور ناجائز طریقوں سے زیادہ سے زیادہ سمیٹ لیں۔ دوسروں کے حقوق غصب کر لیں۔ ہم اسی جنون میں دوسروں کو اپنے پاؤں تلے روندتے چلے جاتے ہیں۔

ہم میں سے ایک فرد دوسرے فرد کے قتل کے درپے ہے۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کی جان کا لیوا ہے۔ ایک مملکت دوسری مملکت کو تباہ کرنے کی فکر میں ہے — کاہے کے لئے؟ صرف اس لئے کہ ہم زیادہ سے زیادہ سمیٹ سکیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس نسبت سے کوئی زیادہ سمیٹتا ہے اسی نسبت سے کوئی دوسرا اور زیادہ محتاج ہو جاتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ایک طرف وہ طبقہ بڑھتا جا رہا ہے جو رزق کے سرچشموں پر سانپ بن کر بیٹھا ہے اور دوسری طرف اس انبوہِ کثیر میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے جو نانِ شبینہ تک کے لئے بھی ان کا محتاج ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن اس کے باوجود عدم تحفظ — (INSECURITY) کا احساس روز بروز شدید ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اب خواتین و حضرات! ہماری زندگی کا مقصد اور منتہیٰ یہی رہ گیا ہے۔

زندہ رہنے کی اس جنونانہ تگ و تاز سے ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے بعض زندہ رہ جائیں — خواہ وہ اس جنگ آزمائی سے کتنے ہی زخمی کیوں نہ ہو چکے ہوں — لیکن سوال پھر وہی سامنے آتا ہے کہ اس جنون آمیز سعی و کاوش کا آخر مقصد کیا ہے؟ ہم کام کرتے ہیں، دن رات کام کرتے ہیں اور کام کرتے کرتے تھک کر نڈھال ہو جاتے ہیں — اس سے ہمیں کیا ملتا ہے؟ — محض روٹی! ہم پھر دوسرے دن اٹھ کر کام کرنے لگ جاتے ہیں۔ کاہے کے لئے؟ — محض اس لئے کہ ہمیں زندہ رہنے کے لئے روٹی مل جائے — ہم دن رات محنت کرتے ہیں۔ کس لئے؟ اس لئے کہ ہماری یہ بے مقصد زندگی زیادہ سے زیادہ لمبی ہو جائے۔ ہماری یہ بے مقصدی مستقل ہو جائے۔

بارالٰہا! یہ زندگی کے ساتھ کیا مذاق ہو رہا ہے۔ یہ انسانیت کی کس قدر تذلیل ہے۔ ہماری تمام انسانی صلاحیتیں، استعداد، توانائی، وقت، عقل و خرد، سب روٹی حاصل کرنے میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ ہم سے تو حیوانات ہی اچھے ہیں جنہیں اپنے زندہ رہنے کے لئے کبھی اس قسم کی دردسری نہیں کرنی پڑتی۔ یہ انسان جو اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتا ہے، اپنے غلط نظامِ زندگی کی بدولت، حیوانوں سے بھی پست تر سطح پر آ چکا ہے۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ مجھے، آپ کو، اور ہر انسانی بچہ کو، اس کی ضروریاتِ زندگی، بغیر جگر پاش مشقتوں کے فطرت کے سیدھے سادھے طریق کے مطابق، از خود ملتی جائیں، اور جہاں اس میں کوئی رکاوٹ پڑے، ہر فرد اسے بطور اپنے بنیادی حق کے طلب اور حاصل کر سکے؛ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں اور آپ کام کریں۔ زیادہ سے زیادہ کام کریں۔ لیکن اس لئے کہ ہم کام کرنا چاہتے ہیں۔ نہ اس لئے کہ ہم کام کرنے پر مجبور ہیں، اس ڈر کے مارے کہ اگر کام نہ کیا تو ہم بھوکے مر جائیں گے۔ محض روٹی کی خاطر زندہ رہنا، زندگی نہیں کہلا سکتا — زندگی یہ ہے کہ انسان، کام کرنے

کہ وہ اپنے آپ پر تو پابندیاں عاید کرے، کوئی دوسرا اس پر پابندی عاید نہ کرے۔ انسان اور حیوان میں یہی فرق ہے۔ حیوان دوسروں کی منشاء کے مطابق کام کرتا ہے۔ کیونکہ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے انسان اپنے اختیار و ارادہ سے کام کرتا ہے۔ سوچئے کہ اس کام میں کس قدر لذت اور حسن ہوگا جسے ہم بھوک کے اس بھیڑیئے کے خوف کی وجہ سے نہ کریں جو ہر وقت ہمارا دروازہ کھٹکھٹاتا رہتا ہے۔ لیکن ہم اس لذت کو کیا جانیں ۔۔۔ اس لذت سے ہم میں سے کوئی بھی آشنا نہیں کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی اس بھیڑیئے کے خوف سے مامون نہیں۔ اگر انسان کو فکرِ معاش سے آزاد اور مطمئن کر دیا جائے تو اس کی جس قدر بے پناہ مضمر صلاحیتیں، بلند تخلیقی مقاصد کے لئے فارغ ہو جائیں گی ان کا آج اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ ایک بلند مقصد کے لئے، دل کے پورے لگاؤ اور اطمینان کے ساتھ مصروفِ کار ہو جانے کے نتائج کس قدر درخشندہ ہوں گے۔ اور اس سے خود کام کرنے والے کی صلاحیتوں کی کسقدر نشو و نما ہوتی جائے گی ۔۔۔ میں بحالاتِ موجودہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن بایں ہمہ، میں زندہ رہنا چاہتی ہوں لیکن صرف روٹی کی خاطر نہیں ۔۔۔ میں کام کرنا چاہتی ہوں لیکن حصولِ معاش کے لئے نہیں ۔۔۔ لیکن موجودہ معاشرہ میں اس کی فکر کس کو ہے کہ یہ دیکھتا پھرے کہ کون تخلیقی مقاصد کی خاطر کام کرتا یا کرنا چاہتا ہے جبکہ زندگی کا مقصد محض حفاظتِ خویش ۔۔۔ (SELF - PRESERVATION) اور افزائشِ نسل (PROCREATION) رہ گیا ہو۔ جب مقصدِ حیات محض تولید رہ جائے تو تخلیق کا کسے خیال ہو سکتا ہے؟

گذشتہ ستمبر کی جنگ کے مسئلہ کو ہمارے سیاسی لیڈر اپنے مفاد و مقاصد کی خاطر کافی استعمال کر چکے ہیں۔ اس لئے اِس وقت اس کا ذکر شاید فرسودہ اور غیر مؤثر خیال کیا جائے۔ لیکن زندگی کے بلند حقائق کو ذہن نشین کرانے کے لئے ایک ایسے واقعہ کو تمثیلاً پیش کرنا جس کا ہم سب تجربہ کر چکے ہیں، زیادہ مؤثر اور دلنشیں ہوتا ہے اور میں اس مقصد کے پیش نظر اس کا ذکر غیر محل نہیں سمجھتی ۔۔۔ اس جنگ کے زمانے میں، ایک مشترکہ خطرہ کا مقابلہ کرنے اور ایک متحدہ مقصد کی خاطر جد و جہد کرنے سے ہمارے اندر وہ روح بیدار ہو گئی تھی جو زندگی کی اس اہم حقیقت کو بے نقاب کر دیتی ہے کہ زندگی وہی زندگی کہلانے کی مستحق ہوتی ہے جس میں ہر فرد دوسروں کی خاطر زندہ رہے۔ اس جنگ کے ان بڑے بڑے واقعات کو چھوڑیئے جن کی مثال تاریخ کے اوراق پیش کرنے سے قاصر ہیں ۔۔۔ آپ چھوٹے چھوٹے واقعات کو دیکھئے تو ان سے بھی یہ حقیقت واشگاف ہو جاتی ہے

کہ وحدتِ مقصد، افرادِ ملت کے اندر کس قدر جذبۂ ایثار پیدا کر دیتی ہے۔ ایک ہوائی حملہ سے ایک خاندان کے پانچ افراد شہید ہو گئے اور صرف ایک باقی بچا۔ اس سے جب اس نقصان کا ذکر آیا تو اس نے نہایت اطمینان سے کہا کہ اس بم سے اس کے خاندان کے تمام افراد بے شک شہید ہو گئے لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ بم اس کے گھر پر آکر گرا۔ اگر وہ ذرا پیچھے گرتا تو ہمارا ایک بڑا اہم فوجی اڈہ تباہ ہو جاتا مجھے اس کے محفوظ رہ جانے کی زیادہ خوشی ہے ؎

چمن تو برقِ حوادث سے ہو گیا محفوظ
میری بلا سے اگر میرا آشیاں نہ رہا!

میں پوچھتی ہوں کہ یہ چھوٹا سا واقعہ، دوسروں کی خاطر جینے کی اُس بلند ترین آرزو کا آئینہ دار نہیں جس سے زیادہ انسانیت ساز آرزو کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی۔ جس جنگ سے قلبِ انسانیت میں چھپی ہوئی اس قسم کی مقدس آرزوئیں یوں بیدار ہو جائیں، اس پر امن کی ہزاروں راحتیں قربان کی جا سکتی ہیں۔ ہم نے اس قسم کا نادر اور بلند تجربہ نہ اس سے پہلے کیا تھا، نہ اس کے بعد دیکھنے میں آیا ہے یہ، دوسروں کو زندہ رکھنے کے لئے، ہنستے کھیلتے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا ولولہ، بڑی متاعِ گراں بہا ہے ــــ کس قدر حسین تھے ہمارے یہ جذبات اور کیسی تابناک تھیں ہماری یہ آرزوئیں!

میں حیران ہوں کہ جنگ کے بعد وہ آرزوئیں کیا ہوئیں ــ وہ جذبات کہاں چلے گئے ــ ہم ہزار جان سے چاہتے ہیں کہ ان گم گشتہ تمناؤں اور دفن شدہ جذبات کو کہیں سے پھر ڈھونڈھ لائیں ــ لیکن اب ایسا ممکن نظر نہیں آتا ــ یہ کیوں ہے؟ ــ اس لئے کہ اب قوم کے سامنے کوئی مشترکہ مقصد نہیں ــ کوئی متحدہ نصب العین نہیں ــ اگر ہمارے سامنے کوئی مشترکہ مقصد ہو اور فکرِ معاش سے ہمیں آزاد کر دیا جائے تو دیکھئے وہی جذباتِ ایثار و محبت پھر سے کس طرح لوٹ نہیں آتے! لیکن اس قسم کے نظام کے بغیر، اپنا سب کچھ دے دینا، (مہاتما بدھ) کی طرح دنیا تیاگ دینے کے مرادف ہو گا جس کا حاصل کچھ نہیں ــ یہ زندگی کے حقائق سے فرار ہے ــ میں اپنا سب کچھ انسانیت کی خاطر قربان کر دینے کے لئے تیار ہوں، لیکن مہاتما بدھ کی طرح نہیں ــ! میں چاہتی ہوں کہ زمانۂ امن میں بھی ہم انہیں کیفیات و جذبات کو لئے ہوئے زندہ رہوں جن جذبات سے ہماری فضا حالتِ جنگ میں معمور تھی۔ لیکن اب یہ ممکن نہیں۔ اس لئے کہ ایسی فضا پیدا کرنا کسی ایک فرد کے بس کی بات نہیں۔ یہ اجتماعی مسئلہ ہے۔ جب تک ساری قوم کے اندر پھر سے وہی جذبات بیدار نہ ہو جائیں وہ فضا پیدا نہیں ہو سکتی جس میں زندگی ہزار خطرات کی موجودگی میں بھی مسکراتی، کھیلتی، مچلتی

نظر آتی ہے۔

میں اس اہم بنیادی حقیقت کو پھر دہرا دینا چاہتی ہوں کہ انفرادی طور پر زندگی کا کوئی تجربہ حاصل کیا ہی نہیں جا سکتا۔ انسانی تجربہ، انسانوں کے باہمی تعلقات سے حاصل ہوتا ہے۔ کسی جزیرے میں تنہا انسان کا، عظیم انسان بننا تو ایک طرف، وہ عام انسانی سطح تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔ انسانی ذات کے مضمرات، دوسروں کے ساتھ تعلقات اور معاملات کے وقت ہی مشہود ہوتے ہیں۔ انسان اپنے آپ کو صرف اسی صورت میں پا سکتا ہے۔ کہنے کو تو ہم بھی ایک معاشرہ میں اجتماعی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن یہ زندگی پتھروں اور چٹانوں کی زندگی ہے، جیتے جاگتے انسانوں کی نہیں۔ جس معاشرہ میں، ہر آنے والی نسل کے جذبات و عواطف اپنی پیش رو نسل کے عین مطابق ہوں ـــ اور یہ سلسلہ صدیوں سے علیٰ حالہٖ چلا آ رہا ہو ـــ اسے آپ زندہ انسانوں کا معاشرہ کہیں گے؟ ہماری حالت یہ ہے کہ جس طرح ہم نہایت حتم و یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آج سے سو سال بعد سورج گہن کب اور کس طرح لگے گا۔ اسی طرح ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ہماری آنے والی نسل کے جذبات و مقاصد کیا ہوں گے۔ ان کے سامنے زندگی کی وہی گزرگاہیں ہوں گی جن سے ان کے اسلاف گزرے تھے۔ اور ان گزرگاہوں میں پیش آنے والے واقعات و حوادث کے متعلق ان کا ردّ عمل بھی بعینہٖ وہی ہوگا۔ جو ان کے آباؤ اجداد کا تھا۔ ان کی خوشی اور غم کے پیمانے بھی وہی ہوں گے۔ وہی کھلونے ان کا بھی دل بہلائیں گے جو ان کے بڑے بوڑھوں کا جی لبھاتے تھے۔ وہ بھی انہی کی طرح گل و بلبل کے افسانوں میں کھوئے رہیں گے اور چاند میں بیٹھی ہوئی چرخہ کاتنے والی بڑھیا سے زندگی کے سربستہ رازوں کا مطلب پوچھیں گے۔ وہ انہی کی سی ناکامیوں اور نامرادیوں کی زندگی جئیں گے اور بالآخر انہی کی سی حسرت و یاس کی موت مر جائیں گے ـــ نہ ان کے جینے میں کوئی ندرت ہوگی، نہ ان کے مرنے میں کوئی جدت ـــ وہ جوانی سطح پر زندگی کے دن گزاریں گے اور ان کی ذات ان کی لاش کے ساتھ ہی کفن میں لپٹی ہوئی آغوشِ لحد میں جا سوئے گی۔ وہ اپنے جذبات کی وسعتوں، اپنے احساسات کی گہرائیوں، ان کی مضمر صلاحیتوں کی بیداریوں سے یکسر محروم رہیں اسلئے کہ "ہر جدت گمراہی ہے" کا وعظ عمر بھر ان کے کانوں میں پڑتا چلا جائے گا ـــ اسلاف کی پامال راہوں سے ایک قدم ادھر ادھر ہونا ـــ زندگی کی نئی شاہراہیں تلاش کرنا ـــ اپنے تیشے سے اپنا راستہ آپ ہموار کرنا ـــ اپنے لئے آپ سوچنا ـــ آپ انتخاب کرنا، اور آپ فیصلے کرنا ـــ سب ان کے لئے حرام قرار دے دیا جائے گا

میں ندرتِ فکر و عمل کی حیات بخش لذت یا ہیوں سے قطعاً محروم ہوں کیونکہ میں نے اس فضا میں

آنکھ کھولی ہے جہاں یہ سب کچھ شجرِ ممنوعہ کی طرح (OUT OF BOUND) ہے۔ کیا اس کے بعد میں کہہ سکتی ہوں کہ میں زندہ ہوں؟ کیا ہم میں سے کوئی بھی ایسا کہہ سکتا ہے؟ — ایک غار میں بیٹھے ہوئے سادھو کی طرح میرا امروز، دیروز ہی کی تصویر ہے — اور میرا فردا میرے امروز کا آئینہ ہوگا۔ حیوانی زندگی کو حرکتِ دوری (CYCLIC ORDER) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسے کولہو کے بیل سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ لیکن ہماری یہ زندگی تو کولہو کے بیل کی سی بھی نہیں۔ وہ بے شک کسی منزل تک نہیں پہنچتا لیکن چلتا تو رہتا ہے۔ یہاں تو ایک قدم اٹھانا بھی حرام قرار دے دیا جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس زندگی کا نام کیا رکھا جائے۔ اگر اسے موت کہا جائے تو میں ڈرتی ہوں کہ موت، ہم پر ہتکِ عزت کا دعوےٰ نہ کر دے۔

لیکن اس کے باوجود میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ اس لئے کہ یہ کائنات بڑی حسین ہے۔ اس کی ہم آہنگی اور توازن — اس کا رنگ و چنگ — اس کا نغمہ و موسیقی — اس کی نزہت و پاکیزگی — ان میں سے ایک ایک انسانی دل و دماغ کے بربط کے تاروں کو چھیڑتے اور ان میں خوابیدہ نغموں کو بیدار کرتے ہیں — لیکن یہاں بھی بدقسمتی سے ہمارا تقدس مآب طائفہ آگے بڑھتا اور کہتا ہے کہ یہ دنیا قابلِ نفرت ہے۔ اس سے دور بھاگو۔ اگر ہم کائنات کی وجد آفریں رنگینیوں سے لذت یاب ہوتے ہیں تو اس کے ماتھے پر سینکڑوں شکن پڑ جاتے ہیں — اور وہ کون سی معقول بات ہے جس پر اس کی مقدس پیشانی شکن آلود نہیں ہو جاتی؟ ہماری عقل و فکر، دلیل و برہان، علم و بصیرت، ہمارا اختیار و ارادہ — ان میں سے ہر شے اس کے نزدیک انسان کو جہنم رسید کر دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ہمیں ان مقدسین کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے! کہ ان بیچاروں کی حالت قابلِ رحم ہے۔ اور خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ ہم ان میں سے نہیں ہیں۔ لیکن یہاں یہ مشکل آن پڑتی ہے کہ جب تم انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر الگ ہونا چاہو گے تو تم اپنے آپ کو تنہا پاؤ گے۔ اور تنہا انسان کائنات کے حسن و جمال سے کیف اندوز نہیں ہو سکتا۔ تحسینِ حسن کا تقاضا ہے کہ آپ اس میں دوسروں کو بھی شامل کریں۔ لیکن آپ کو وہ رفقاء کہاں سے ملیں گے جو اس کیف و نشاط میں آپ کے ہم آہنگ ہوں۔ یہ تنہائی بڑی الم انگیز ہوتی ہے لیکن دوسری طرف یہ کیفیت بھی کچھ کم دردآلود نہیں کہ جب آپ اس تنہائی سے گھبرا کر معاشرہ کی طرف آتے ہیں تو وہاں آپ کو مجبوراً وہ کچھ دیکھنا، سننا اور پڑھنا پڑتا ہے جس سے انسان کا ذوقِ لطیف خون ہو کر رہ جاتا ہے۔

اُف! کس قدر اذیت دہ ہے یہ زندگی! لیکن ہم چونکہ زندگی کی حقیقی مسرتوں سے آشنا ہی نہیں

اس لئے ہمیں اس کا بھی احساس نہیں ہو سکتا کہ ہم کیا کھو رہے ہیں۔

لیکن اس تمام حرماں نصیبی کے باوجود، میں سپر انداز ہونے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے جو میرے راستے میں حائل ہونا چاہتا ہے اس سے کہہ دو کہ وہ ذرا سوچ سمجھ کر سامنے آئے۔ میرے پاس اور کچھ نہ سہی لیکن بایں ہمہ، ایک ایسی تقدیر شکن قوت موجود ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی قوت نہیں کر سکتی۔ اور وہ ہے میری قوتِ ارادہ ۔ میرے اختیار و انتخاب کی آزادی ۔ میری (FREE WILL) ۔ یہ وہ قوت ہے جو سخت سے سخت نامساعد ماحول اور ناساز گار معاشرہ کو زیر و زبر کر سکتی ہے۔ میں صاحبِ اختیار و ارادہ انسان ہوں جس سے کہا گیا تھا کہ ؎

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ برہم زن

زندگی ایک چیلنج ہے۔ ہمارے معاشرہ کی پوری بساط انسان کو قدم قدم پر دعوتِ مبارزت چیلنج دیتی ہے اور نامساعد حالات کے چیلنج میں ایک ایسی ارتعاش انگیز لذت ہوتی ہے جس سے وہی آشنا ہو سکتا ہے جس نے کبھی یہ چیلنج قبول کیا ہو۔ جس قدر سخت یہ چیلنج ہوگا، اسی قدر اس کی لذت زیادہ ہوگی۔ جس قدر مخالفت زیادہ شدید ہوگی اسی قدر فتح و کامیابی زیادہ عظیم ہوگی۔ جونہی آپ نے اور میں نے اس کا عزم کر لیا کہ ہم نے انسانوں کی سی زندگی بسر کرنی ہے اس بساطِ کہن کا ہر شکن ہموار ہونا شروع ہو جائے گا۔ یاد رکھیئے۔ خواتین و حضرات! انسان کا کوئی خیال، کوئی لفظ، کوئی عمل نتیجہ پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی وہ امید کی کرن ہے جو ہمارے دل میں زندہ رہنے کی آرزو کو تازہ رکھتی ہے۔ جب انسان حالات کے بدلنے کا تہیہ کر لے تو پھر زندگی یونہی خلا نہیں رہ جاتی جس میں مہ و سال شماری کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ زندگی کے ماپنے کا صحیح پیمانہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ جب میں نے آنکھ کھولی تھی تو میں نے اپنے ماحول کو کیسا پایا تھا اور جب میں آنکھ بند کر کے یہاں سے چلی ہوں تو میں نے اسے کیسے چھوڑا ۔ اگر ہم ہمہ جوڑ کر بیٹھ گئے اور مصافِ زندگی میں ایک عزم راسخ لے کر کھڑے ہو گئے تو پھر دنیا کی کوئی مخالفت ہمارا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ پھر ہم زندگی کی توانائیوں سے بہرہ یاب ہوتے چلے جائینگے اور جب اس دنیا کو چھوڑیں گے تو یہ آج کے مقابلہ میں کہیں زیادہ حسین، کہیں زیادہ جاذب اور کہیں زیادہ انسانوں کی بستی کہلانے کے قابل ہوگی۔

خواتین و حضرات! میں اس سمع خراشی کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سوال کا جواب دینے کے لئے کہ ـــ میں زندہ کیوں رہنا چاہتی ہوں ـــ مجھے کچھ لمبا چوڑا کہنے کی ضرورت ہی نہ

سمتی۔ جتنا چھوٹا یہ سوال تھا اتنا ہی مختصر اس کا جواب تھا۔ اس کا جواب ایک فقرہ میں دیا جا سکتا تھا۔ اور وہ یوں کہ ـــــ

میں زندہ رہنا چاہتی ہوں اس لئے کہ میں خوش بختی سے اس
ماحول میں پیدا ہوئی ہوں جس میں پرویز جیسی ہستی موجود ہے۔

(والسلام)

---

(۷)

دُو بچیاں

عزیزہ نجمہ کوثر

صدر محترمہ اور بزرگو!

آج کے مذاکرہ میں سوال زیر غور یہ تھا کہ میں زندہ کیوں رہنا چاہتی ہوں۔ میں ایک سٹوڈنٹ ہوں اور سٹوڈنٹ کی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ اُسے کتاب سے پڑھایا جائے وہ اسے خدا کی وحی کیطرح سچا سمجھے۔ تعلیم کا مقصد ہی یہ ہے کہ طالب علم کو سچے اور جھوٹے میں فرق کرنا آجائے۔ جو کچھ اُسے پڑھایا جاتا ہے اگر اُسے اس کی سچائی پر یقین نہ ہو تو وہ تعلیم کیا حاصل کرے گا؟ جو کچھ کتابوں میں لکھا ہوا اس کے سچا ہونے پر یقین ہی تو ہے جس کی بنا پر ان کتابوں سے کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ زندگی کے متعلق ہمیں استاد ذوق کا یہ شعر پڑھایا جاتا ہے کہ ؎

لائی حیات آئے، قضا لے چلی، چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

جب کیفیت یہ ہو کہ نہ ہمارے یہاں آنے میں ہمارا کوئی دخل ہو، نہ یہاں سے چلے جانے میں ہماری کسی خواہش یا ارادے کا کوئی واسطہ۔ تو پھر یہ سوال ہی کیسے پیدا ہو سکتا ہے کہ

"میں زندہ کیوں رہنا چاہتی ہوں"

چاہنے یا نہ چاہنے کا سوال تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کوئی بات ہمارے اختیار میں ہو! لیکن عزیزانِ من! اگر اسے بزرگوں کی شان میں گستاخی نہ سمجھا جائے تو میں عرض کرونگی۔

کہ حضرت ذوق نے جو کچھ فرمایا ہے وہ انسان کے متعلق نہیں۔ حیوانوں کے متعلق ہے۔ یہاں آنے میں تو بے شک انسان اور حیوان دونوں بے اختیار ہوتے ہیں لیکن جہاں تک یہاں سے جانے کا سوال ہے، حیوان مجبور ہوتا ہے اور انسان صاحبِ اختیار۔ انسان جب جی چاہے خودکشی کر کے یہاں سے جا سکتا ہے۔ لیکن حیوان خودکشی نہیں کر سکتا۔ اس لئے زندہ رہنے کے لئے دنیا میں انسان کے چاہنے کو بڑا دخل ہے۔

باباجی درس میں بتایا کرتے ہیں کہ انسان، حیوان اور خدا کی درمیانی کڑی ہے۔ یعنے اس کے نیچے حیوان ہے اور اس کے اوپر خدا۔ حیوان کی بات ہم نے دیکھ لی کہ وہ اپنے اختیار اور ارادہ سے نہیں جیتا۔ اسے جینے کی مجبوری ہے۔ جہاں تک خدا کا تعلق ہے اس کی بابت قرآن شریف میں لکھا ہے کہ وہ زندہ ہے کبھی مرتا نہیں۔ وہ مر سکتا ہی نہیں ـــ اب ظاہر ہے کہ جو مر نہیں سکتا اُسے بہرحال زندہ رہنا ہے۔ اُس کے زندہ رہنے میں اُس کے چاہنے یا نہ چاہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس لئے میں سمجھتی ہوں۔ کائنات میں یہ خصوصیت انسان کے سوا کسی کو حاصل ہی نہیں کہ وہ اپنے چاہنے سے زندہ ہے ـــ وہ مر سکنے کے اختیار کے باوجود زندہ رہے۔ یہ صرف انسان کی خصوصیت ہے۔

اور جب خدا نے انسان کو یہ شرف عطا کیا ہے کہ وہ اپنی مرضی اور اپنے اختیار و ارادہ سے زندہ رہے تو میں سمجھتی ہوں کہ جو انسان زندہ رہنے کا تہیہ کر لے وہ کبھی مر نہیں سکتا۔ حیوان کیوں مر جاتا ہے اس لئے کہ وہ زندہ رہنے کا تہیہ نہیں کر سکتا۔ خدا کیوں نہیں مرتا؟ اس لئے کہ اس نے زندہ رہنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ سو اگر انسان بھی زندہ رہنے کا تہیہ کر لے تو وہ مر نہیں سکتا۔ ایسے انسانوں کو مردہ کہنا ہی نہیں چاہیئے۔ وہ زندہ ہوتے ہیں۔ اگر میری بات کا یقین نہ آئے تو جلیئے اور واہگہ سیالکوٹ چھمب جوڑیاں کی مٹی کے سرخ ذروں سے پوچھ لیجئے۔ وہ میری بات کی شہادت دینگے کہ جو زندہ رہنے کا تہیہ کر لے وہ کبھی مر نہیں سکتا۔

میں عزیزانِ من! مرنے پر اختیار رکھنے کے باوجود، اس لئے زندہ رہنا چاہتی ہوں کہ میں ایسی موت مروں جس سے انسان مرتا نہیں۔ ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جاتا ہے۔

(والسلام)

(۸)

عزیزہ سلمٰی پرویز

میرے بزرگو! اپنی بیٹی کا سلام لو!

میری بہن تو خلا سفر ہے۔ اس لئے وہ آسمان کی باتیں کرتی ہے۔ میں اس زمین کی رہنے والی آپکی بیٹی ہوں۔ اس لئے باتیں بھی اسی زمین ہی کی کرنا چاہتی ہوں۔

آپ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں زندہ کیوں رہنا چاہتی ہوں۔ میں آپ بزرگوں کو یہ بتانا تو نہیں چاہتی تھی لیکن جب آپ اصرار کرتے ہیں تو آپکی بزرگی کا تقاضا ہے کہ بات بتا دی جائے۔ ذرا غور سے سنئے گا۔

میں آٹھویں جماعت میں پڑھتی کہ میں نے اسی کنونشن میں آپکے سامنے اپنا ایک دکھڑا رویا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ آپ ہمیں گھر میں تو بتاتے ہیں کہ رات کیوقت سورج امریکہ چلا جاتا ہے اور اسکے بعد ہمیں جس اسکول میں بھیجدیتے ہیں وہاں باقاعدہ وضو کرا کر، قبلہ رُو بٹھا کر یہ بتایا جاتا ہے کہ رات کے وقت سورج خدا کے عرش کے نیچے چھپ جاتا ہے اور دوسری صبح اسے فرشتے نکال کر دنیا میں واپس بھیجدیتے ہیں۔ جب امتحان میں سوال آتا ہے کہ رات کیوقت سورج کہاں جاتا ہے۔ تو اگر ہم سچی بات کہہ دیں تو ہمیں فیل کر دیا جاتا ہے۔ اور اگر پاس ہونے کا خیال ہو تو پھر ہمیں جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔ میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ بتایئے ہم کیا کریں؟ قرآن شریف کی سچی بات کہہ کر مار کھائیں اور فیل ہو جائیں یا جھوٹ بول کر پاس ہو جائیں اور آپسے انعام پائیں۔ آپنے میرا یہ دکھڑا سنا تھا اور کہا تھا کہ بیٹی! تھوڑا سا انتظار کرو۔ ہم تمہاری تعلیم کا ایسا انتظام کریں گے جس میں یہ کشمکش نہ ہو۔

میں نے آپ کے وعدہ پر اعتبار کیا اور ایک سال اور جیتی رہی۔ جب اس تعلیم کا کوئی انتظام نہ ہوا تو دوسرے سال میں نے آپ کی خدمت میں پھر عرض کیا کہ آپ کب تک ہم سے یہ جھوٹ بلواتے رہیں گے۔ یاد رکھیئے! اس سے ہمیں جھوٹ بولنے کی عادت پڑ جائے گی اور پھر آپ خفا ہونگے کہ اس نئی نسل کو کیا ہو گیا۔ آپنے پھر اپنا وعدہ دہرایا اور کہا کہ بیٹی! ایک سال اور انتظار کرو! میں نے اپنی بہن کے الفاظ میں ایک سال اور زندہ رہنے کا تہیہ کر لیا لیکن آپنے ہماری مشکل کا حل پھر بھی نہ سوچا۔

چنانچہ اس سال میں نے سوچا تھا کہ اس طرح مسلسل جھوٹ کی زندگی سے کیا حاصل؟ چھوڑو اس خیال کو۔ کہ اتفاق سے ایک دن اپنے کورس کی کتاب میں غالب کا یہ شعر نظر سے گزرا کہ :- ؎

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ　　　کوئی دن اور بھی جئے ہوتے

چونکہ میں نے سن رکھا تھا کہ غالب سمجھدار آدمی تھا اور باتیں بڑی کام کی کیا کرتا تھا اس لئے میں نے سوچا کہ اس نسخہ کو بھی آزما دیکھنا چاہیئے۔ کوئی دن اور بھی جی کر دیکھ لینا چاہیئے۔ شاید غالب سچا ہو، اور ہمارے یہ بزرگ راہ پر آجائیں اور اپنے بچوں اور بچیوں کی حالت پر رحم کھا کر، ان کی تعلیم کا ایسا انتظام کر دیں جس سے انہیں سچ بول کر مار نہ کھانی پڑے اور پاس ہونے کا لالچ انہیں جھوٹ بولنے پر مجبور نہ کرے۔

لہٰذا! میرے واجب الاحترام بزرگو! میں تو اس لئے جینا چاہتی ہوں کہ جب آپ ہماری تعلیم کے سلسلہ میں کوئی وعدہ کر کے پھر کنونشن میں آئیں تو آپ کو اس کا خیال رہے کہ ہم سے اس وعدے کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ شاید میرے بعض بزرگ، میری اس گستاخی پر ناراض ہوں کہ بچوں کو کیا حق ہے کہ وہ بڑوں سے پوچھیں کہ آپ نے وہ وعدہ کیوں پورا نہیں کیا۔ لیکن ابھی اگلے دنوں باباجی نے اپنے درس میں بتایا تھا کہ خود اللہ میاں نے کہا ہے کہ میں نے تم سے جو وعدہ کیا ہے تم اس کے متعلق مجھ سے پوچھ سکتے ہو۔ سو جب خدا سے اس کے وعدے کے متعلق اس کے بندے پوچھ سکتے ہیں تو بزرگوں سے ان کے وعدے کے متعلق بچے کیوں نہیں پوچھ سکتے۔ میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ اگر چھوٹوں کو اجازت دے دی جائے کہ وہ بڑوں سے ان کے وعدوں کے متعلق پوچھ سکتے ہیں تو ہمارے معاشرہ کی ہزاروں خرابیاں دور ہو جائیں۔ یہاں مشکل یہی ہے کہ ہر بڑا یہ سمجھتا ہے کہ کسی چھوٹے کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ بڑوں سے ان کے وعدوں کے متعلق پوچھ سکے۔ کہ انہیں پورا کیوں نہیں کیا جاتا۔

سو میرے بزرگو! ایمان کی بات یہی ہے کہ میں تو اس لئے زندہ رہنا چاہتی ہوں کہ آپ سے پوچھ سکوں کہ آپ نے اپنا وعدہ پورا کیوں نہیں کیا۔ اور یہ بات میں اس وقت تک پوچھتی رہوں گی جب تک آپ اس وعدہ کو پورا نہیں کریں گے۔ آپ جب آئندہ کنونشن پر تشریف لائیں گا تو ذرا سوچ کر آئیں گا کہ آپ کے پاس اس سوال کا کیا جواب ہے۔ میری بہن نے کہا ہے کہ جو زندہ رہنے کا تہیہ کر لیتا ہے وہ مرتا نہیں۔ میں نے اس مقصد کے لئے زندہ رہنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اس لئے آپ اس سوال کی گرفت سے چھوٹ نہیں سکیں گے

(والسلام)

صدر مذاکرہ کا آخری تبصرہ

میرے عزیز بھائیو اور بہنو!

سب سے پہلے مجھے طلوع اسلام کنونشن کا شکریہ ادا کرنا ہے جس نے مجھے ایسے پُرعظمت، اور

باوقار مذاکرہ کی صدارت کے اعزاز سے نوازا۔ یہ شکریہ رسمی نہیں۔ میرے دل کی گہرائیوں سے اُبھر رہا ہے۔

اس کے بعد میں سمجھتی ہوں کہ ہم سب کو طلوعِ اسلام کا شکر گذار ہونا چاہیئے جس نے ہمیں اس قسم کا پلیٹ فارم مہیا کیا ہے جس سے ہم پوری آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں اور اس پر سوائے قرآنی حدود کے اور کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ یہ وہ آزادی ہے جو ہمیں اس پلیٹ فارم کے علاوہ اور کہیں بھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ انسان کے دل کی کتنی پھانسیں ہیں جو محض اس لئے ناسور بن جاتی ہیں کہ انہیں باہر نکلنے کا موقعہ نہیں دیا جاتا۔ کہیں معاشرہ کی غیر معقول ملامت کا ڈر، کہیں ضد اور جہالت پر مبنی کفر والحاد کے فتووں کا خوف۔ نتیجہ یہ کہ وہ پھانسیں انسانی فکر و خیال کے ہر گوشے کو زہر آلود بنا دیتی ہیں، اور جب وہ زہر اپنے فطری زورِ دروں سے باہر نکل کر پھیلتا ہے تو اسی معاشرہ کی طرف سے جو اس زہر کا درحقیقت ذمہ دار ہوتا ہے، چیخ و پکار شروع ہو جاتی ہے۔

برادرانِ عزیز! اس مذاکرہ میں، قوم کی نئی نسل کے نمائندوں کی طرف سے زندگی کا جو مقصد پیش کیا گیا ہے، وہ کسقدر پاکیزہ اور بلند ہے۔ کتنی خوش آئند ہیں وہ آرزوئیں جن کا اظہار آج یہاں کیا گیا ہے اور کس قدر خوش بخت ہے وہ قوم جس کے نونہال ایسی مقدس آرزوئیں دل میں لئے ہیں۔ یہ تمام اثر اور نتیجہ ہے طلوعِ اسلام کی تعلیم و تربیت کا ـــــ اس طلوعِ اسلام کی تعلیم کا جسے مفاد پرست گروہ کی ہوسِ انتقام نے اس قدر بدنام کر رکھا ہے کہ جس کے سامنے پہلی مرتبہ اس کا نام لیجئے، وہ یوں تڑپ اٹھتا ہے گویا اُسے بھڑنے کاٹ کھایا ہو۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ دنیا میں جب اور جہاں سے بھی انقلاب کی آواز اٹھی ہے اسکے ساتھ یہی ہوا ہے اور پھر طلوعِ اسلام کا پیش کردہ قرآنی انقلاب کوئی جزئی انقلاب نہیں یہ تو ساری دنیا کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اس کی مخالفت کیوں نہیں ہوگی۔

آج کے مذاکرہ میں جو سوال اٹھایا گیا ہے کہ میں کیوں زندہ رہنا چاہتا ہوں، تو میرا خیال ہے کہ یہ وہ سوال ہے جو ہم میں سے ہر ایک کو اپنے آپ سے پوچھنا چاہیئے۔ جبتک ہم یہ متعین نہیں کر لینگے کہ ہم کیوں زندہ رہنا چاہتے ہیں اسوقت تک زندگی بامقصد ہو نہیں سکتی۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ تم کیوں زندہ رہنا چاہتی ہو، تو میرا جواب تو نہایت سادہ اور مختصر ہے اور وہ یہ کہ میں اسلئے زندہ رہنا چاہتی ہوں کہ میں شمعِ قرآنی کو لیکر اس طرح نکلوں کہ ؎

دُور دنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے ٭ ہر طرف میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے!

آخر میں، میں آپ تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپنے اس مذاکرہ کو نہایت توجہ اور متانت سے سنا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنی زندگی کو اُس کے مقرر کردہ پروگرام کی تکمیل میں صرف کریں، کہ اس سے بڑھ کر زندگی کا کوئی اور مقصد ہو نہیں سکتا۔ (والسلام)

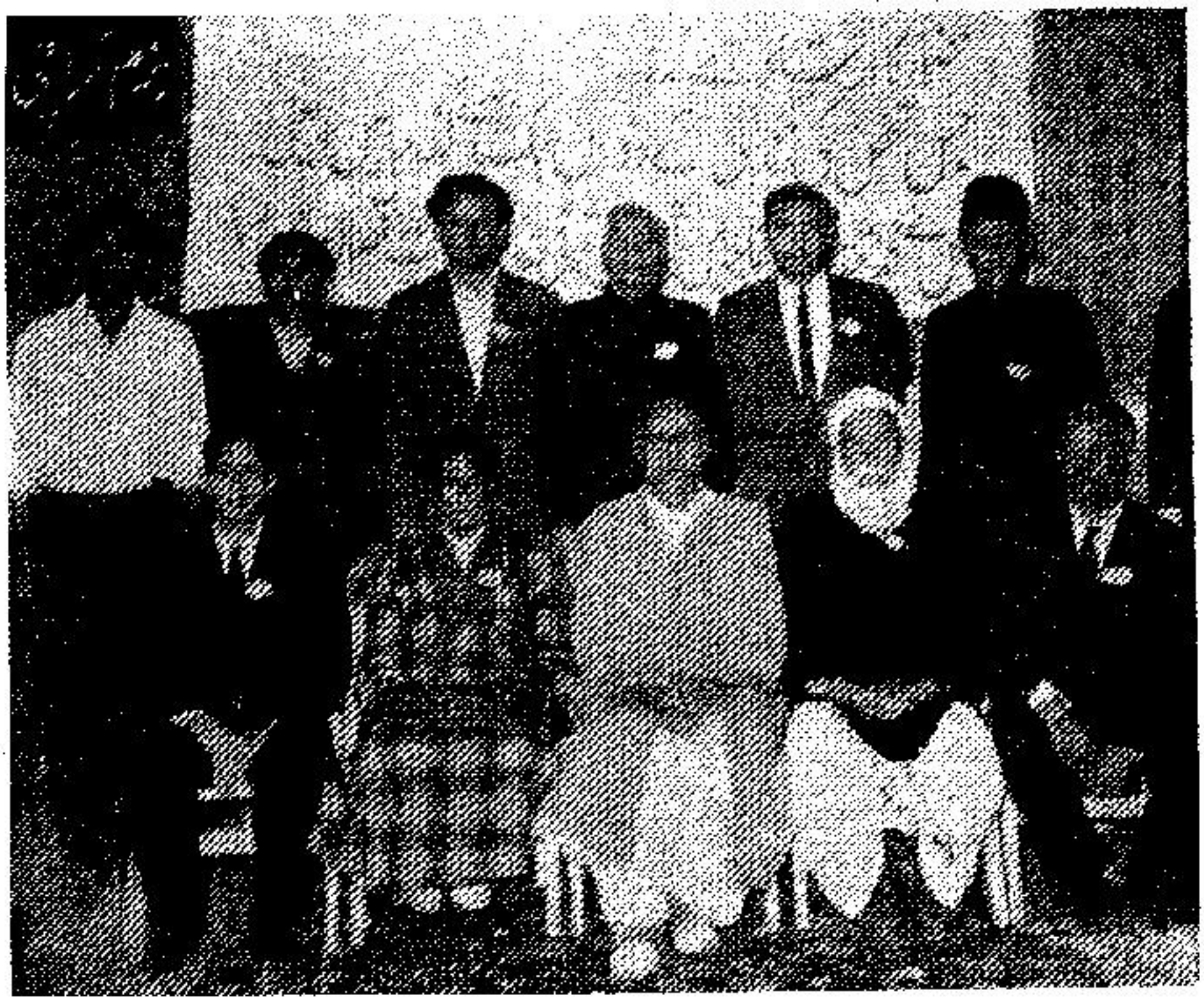

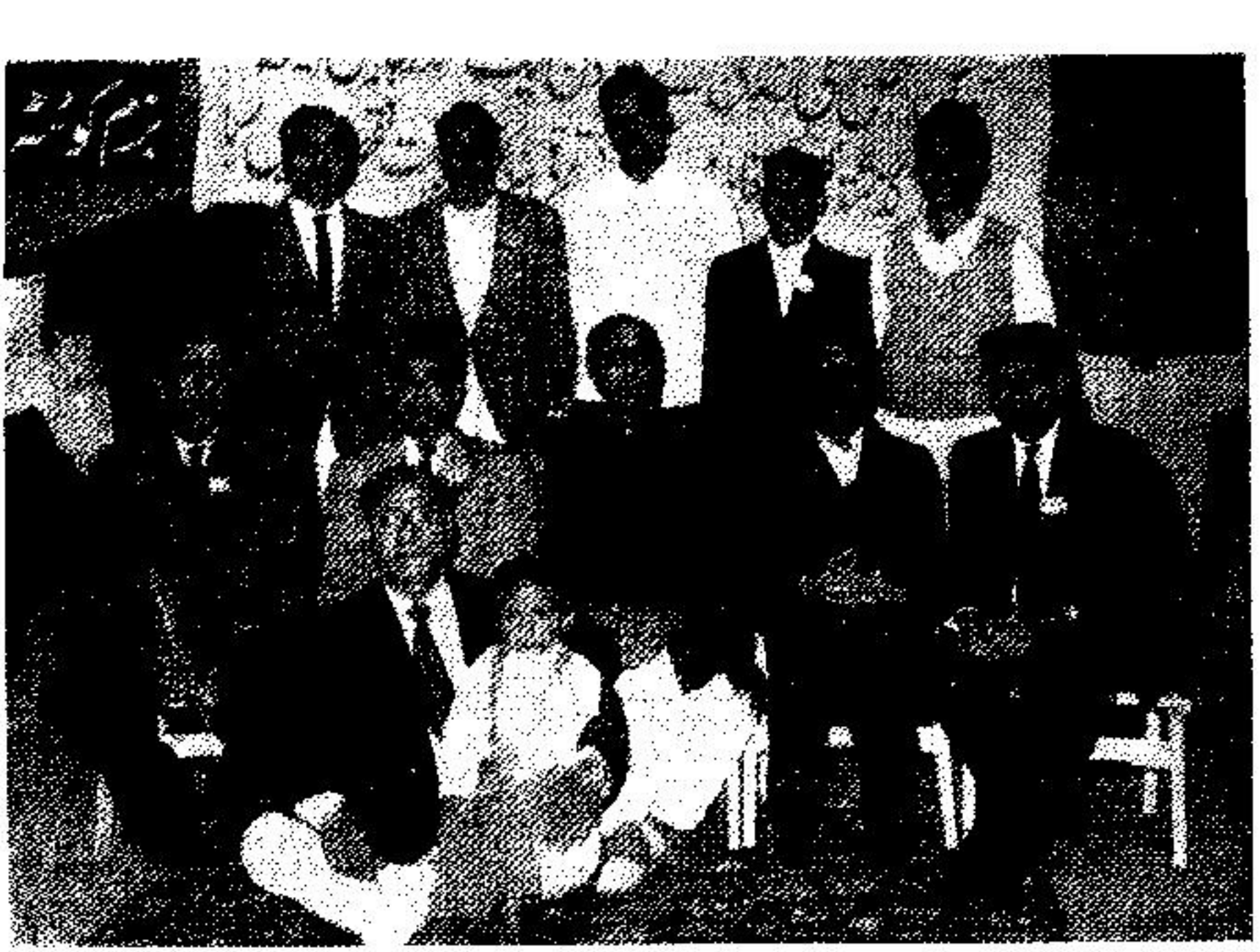

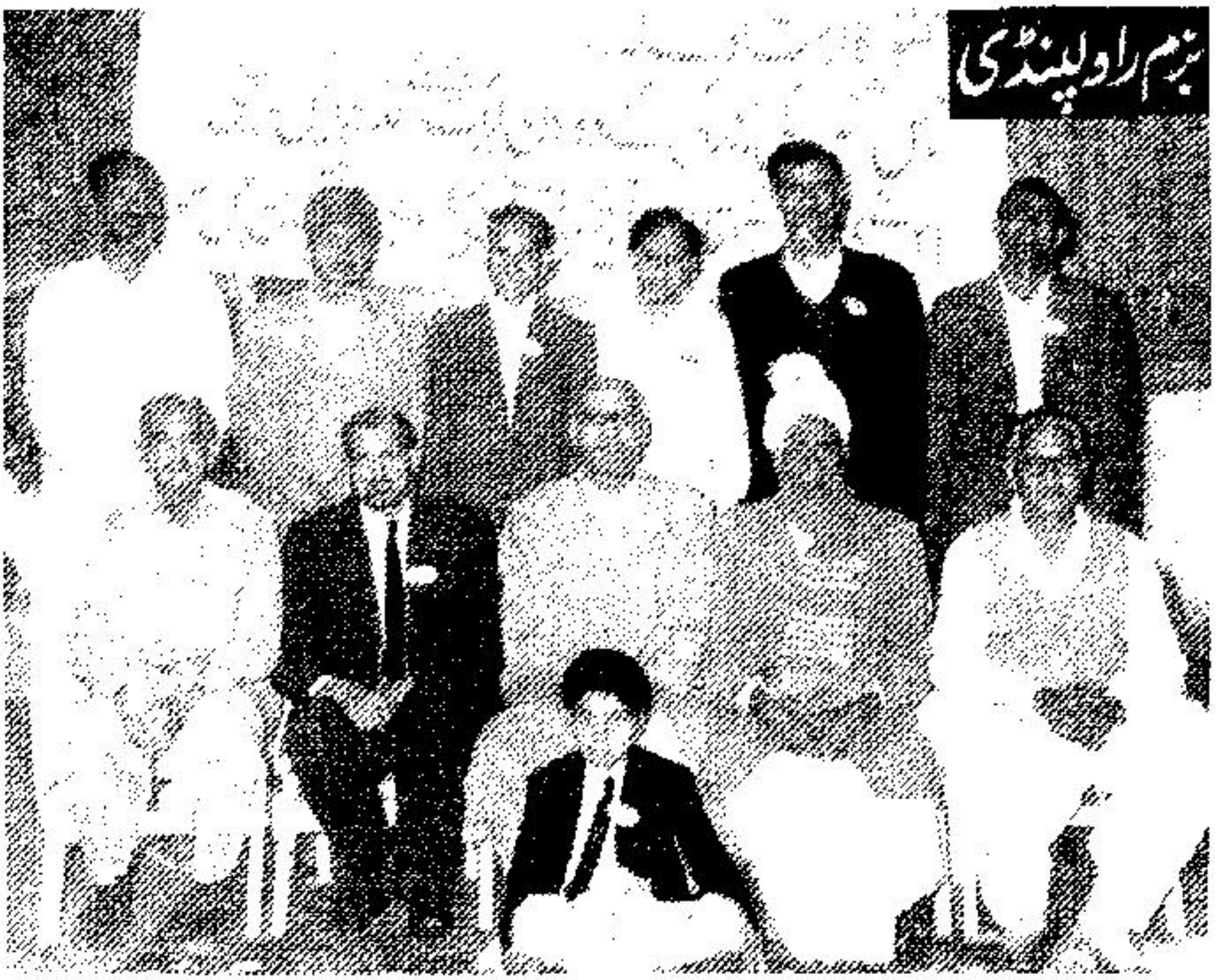

بزم راولپنڈی

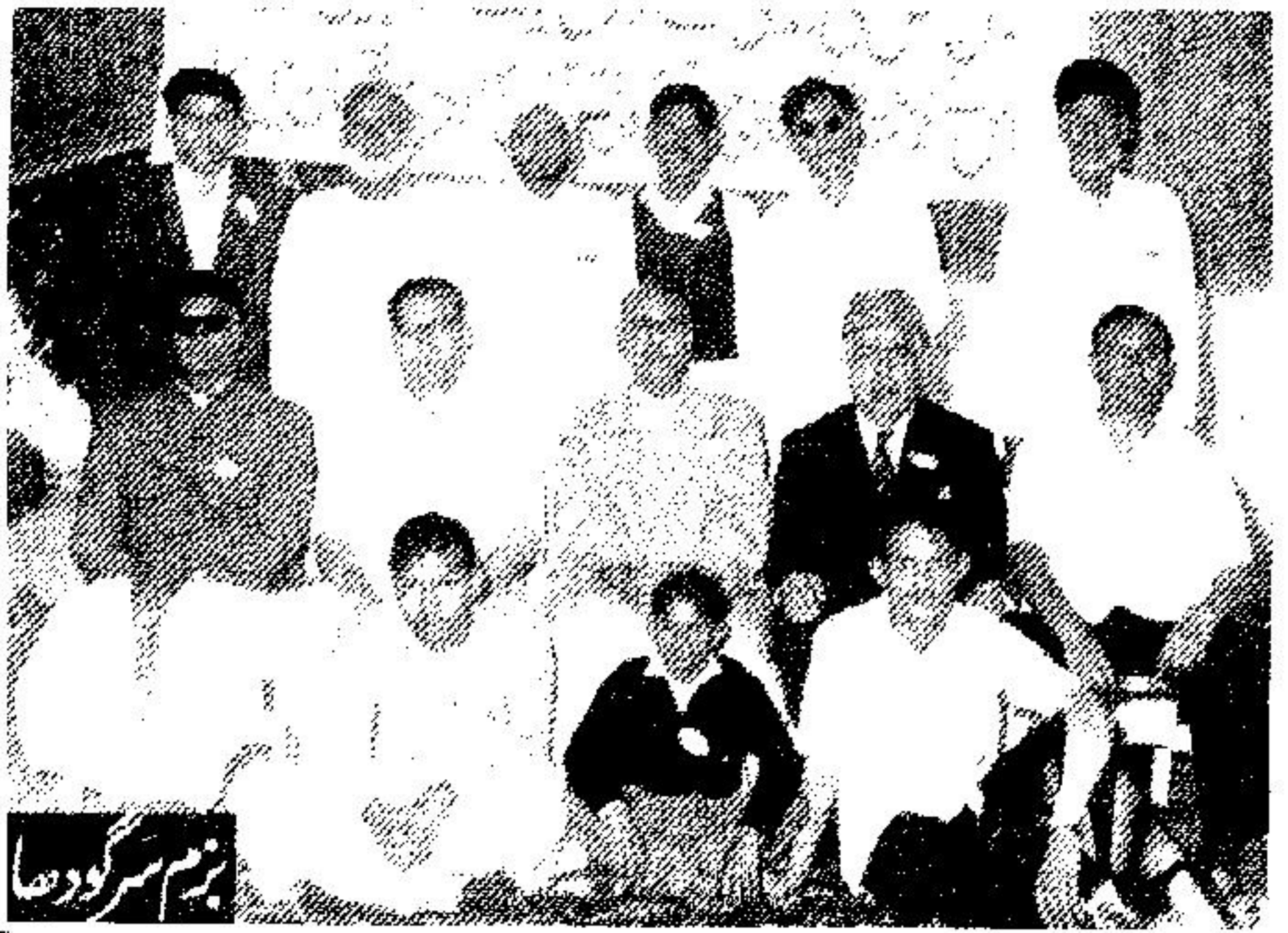

بزم سرگودھا